اردو زبان کی تدریس

(Teaching of Urdu)

FIRST YEAR سالِ اوّل

SOURCE BOOK امدادی کتاب

ڈپلوما اِن ٹیچر ایجوکیشن (ڈی.ٹی.ای)

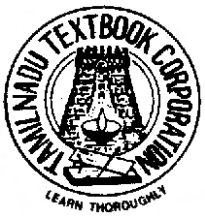

تملناڈو ٹکسٹ بک کارپوریشن

TAMILNADU TEXTBOOK CORPORATION.

اردو زبان کی تدریس
(Teaching of Urdu)

سالِ اوّل

SOURCE BOOK **امدادی کتاب**

DIPLOMA IN TEACHER EDUCATION **ڈپلوما اِن ٹیچر ایجوکیشن**

چھوت چھات ایک گناہ ہے
چھوت چھات ایک بڑا جرم ہے
چھوت چھات ایک غیر انسانی فعل ہے

تملناڈو ٹکسٹ بک کارپوریشن
کالج روڈ، چینئی-600 006
TAMILNADU TEXTBOOK CORPORATION,
COLLEGE ROAD, CHENNAI-600 006.

© Government of Tamilnadu
First Edition - 2008

Chairperson

Dr. Syed Sajjad Husain,
Professor in Urdu
University of Madras
Marina Campus
Chennai-600 005.

Reviewer

Dr. Hayath Basha
Reader and Head
Department of Urdu
Qaid-e-Millath College
Medavakkam, Chennai-600 100

Author and Coordinator

Mrs. S. Shameem
Senior Lecturer
District Institute of Education and Training,
Thirur-602 025, Thiruvallur District.

Authors

Mrs. E. Faizunissa
Principal
Sri Devi Teacher Training Institute,
Ponneri-601 204.

Mrs. Mumtaz Begum
Principal (i/c) Retd
Government Teacher Training
Institute for Women, Royapettah
Chennai - 600 014.

Mrs. Saleema Bi,
Supervisor, (Retd.)
Chennai Corporation Urdu Schools,
Chennai-600 003.

Price : Rs.

This book has been prepared by The Directorte of Teacher Education Research and Tranining on behalf of the Govt. of Tamilnadu

This book has been printed on 70 G.S.M. Paper

Printed by Offset at :

پیش لفظ

ریاست تمل ناڈو میں اردو ٹیچر ٹریننگ کے دوسالہ کورس کوشروع ہوئے تیس سال سے بھی زیادہ کا عرصہ ہو چکا ہے۔لڑکوں کے لئے ٹیچر ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ طاہر صاحب اسٹریٹ چینئی اورلڑکیوں کے لئے احاطہٗ گورنمنٹ ہوبارٹ اسکول فار مسلم گرلس ،چینئی میں مذکورہ بالاکورس کا باضابطہ انتظام ہے ہرسال ان دونوں درس گاہوں میں اسّی طلباء اوراسّی طالبات داخلہ لیتے ہیں۔افسوس اس بات کا کہ یہاں پرزیرتربیت اساتذہ کے لئے اردوزبان اور دیگر اسباق کی نصابی کتابیں میسرنہیں تھیں۔الحمد لِللّٰہ اس مقصد کےتحت حکومت تمل ناڈو نے اردو کےتجربہ کاراساتذہ کی ایک نصابی کمیٹی تشکیل دے کراُسے اردوزبان کی تدریس سے متعلق سال اوّل اورسال دوّم کے لئے نصابی کتابیں تیار کرنے کی ذمہ داری سونپی ہے۔امید کی جاتی ہے کہ اردوزبان کی نصابی کتابوں کی اشاعت کے بعد دیگراسباق کے لئے بزبان اردونصابی کتابیں تیارکرنے کا کام شروع ہوجائے گا۔

اس نصابی کمیٹی کے چیر پرسن ڈاکٹرسید سجادحسین پروفیسرشعبہ اُردو مدراس یونیورسٹی اورمعزز اراکین کی حیثیت سے ڈاکٹرحیات بادشاہ، صدرشعبۂ اردو، قائدملت کالج، میڈاواکّم ،چینئی ، ایس۔شمیم ،سینئرلکچرار DIET, TIRUR ممتاز بیگم وظیفہ یاب پرنسپل انچارج ،ٹیچرٹریننگ انسٹی ٹیوٹ فارگرلس ،چینئی ،ای۔فیض النساء پرنسپل ۔سری دیوی ٹیچرٹریننگ انسٹی ٹیوٹ پونیری اورسلیمہ بی وظیفہ یاب کارپوریشن اردواسکولس سوپروائزرشامل ہیں۔

پیشِ نظر کتاب اردوٹیچرٹریننگ کے سال اول میں زیرتربیت اساتذہ کے لئے ترتیب دی گئی ہے۔اس میں اردوزبان کی بنیادی اوراعلیٰ صلاحیتوں سے متعلق اہم نکات اوراس کی تہذیبی شناخت اورخصوصی موقف کے علاوہ اردو زبان کی خصوصیات کوبھی اجاگرکیا گیاہے۔اردوادب کی مختلف اصناف کا تعارف کراتے ہوئے ہرایک صنف کی تدریس پرسیر حاصل بحث کی گئی ہے۔اس طرح ہم نے شاعری کےتحت غزل نظم ،مثنوی اورمرثیہ کواورنثر کےتحت داستان اور ڈرامے کوشامل نصاب کیاہے۔نیزنظم کی تدریس کے مقاصد پراس لئے بھی روشنی ڈالی ہے کہ طلباءنظم کے اشعار کوموثر پیرایے میں ادا کرسکیں اوراُن خیالات سے متاثر ہوسکیں۔جن کا اظہارشاعر نے اپنے اشعار میں کیا تھا۔نظم کی تدریس کے ذریعہ طلباء میں خداپرستی ،ایثاروقربانی ،رحم دلی ،سچائی اور دیانت داری کا جذبہ پیدا کرنا بھی اس کا ایک اہم مقصد ہے۔نظم کے ذریعہ طلباء کے اندرحب الوطنی کا جذبہ بیدارکیا جاسکتاہےاورفرحت ،سکون اوراطمینان کے سامان بھی مہیّا کئے جاسکتے ہیں۔مقاصد کے اعتبار سے غزل کی تدریس بھی نظم ہی کےتحت آتی ہے۔لیکن غزل کی ایمائیت اوراسلوب

کی انفرادیت کچھ خاص مقاصد کو پورا کرتی ہے اس لئے غزل کی تدریس کے دوران استاد کو خاص طور پر غزل کی شعری روایت کے مخصوص علائم اور رموز کو طلباء کے ذوق وفہم کی حدود میں لانا ضروری ہوتا ہے۔

اس کتاب میں ہم نے تدریس نثر پر بھی خصوصی توجہ دی ہے تا کہ طلباء زبان کے عملی پہلو یعنی بولنے اور لکھنے اور ادراکی پہلو یعنی پڑھنے اور لکھنے کی صلاحیت پر قدرت حاصل کر سکیں۔طلباء میں ذخیرۂ الفاظ، اسلوب بیان، ترتیب خیالات اور زور کلام کا اضافہ کرنا بھی تدریس نثر کا ایک اہم مقصد ہے۔

ہم نے اس کتاب میں تدریس قواعد کو اس لئے شامل کیا ہے کہ طلباء کو زبان کا صحیح استعمال یعنی صحیح بولنا صحیح لکھنا صحیح پڑھنا اور صحیح سمجھنا آ جائے اواس ضمن میں اُن سے سرزد ہونے والی لسانی لغزشوں کا ازالہ بھی ہو جائے۔

زیر نظر کتاب میں زبان کی تدریس کے مختلف طریقۂ کار اور نتائج کا جائزہ لیا گیا ہے اور زبان کے وسیلے سے علم لسانیات اور صوتیات سے متعلق طلباء کو جانکاری بھی دی گئی ہے۔طلباء کو زبان کی بنیادی اور اعلیٰ صلاحیتوں سے روشناس کرانے کے لئے الگ سے ایک باب قائم کیا گیا ہے۔ نیز طلباء کے لئے تعلیمی سرگرمیوں کی ضرورت اہمیت وافادیت کو واضح کیا گیا ہے اور سبق کی تدریس کی منصوبہ بندی کے نکات کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔آخر میں طلباء کی جانکاری کے لئے ضرب الامثال اور محاوروں کی فہرست اور ان کے محل استعمال کی صراحت بھی موجود ہے۔

امید ہے کہ یہ کتاب اردو ٹیچر ٹریننگ سال اوّل میں زیر تربیت اساتذہ کے لئے نہ صرف مفید اور کارآمد ثابت ہوگی بلکہ ان کی تعلیمی اور تدریسی ضرورتوں کو بھی پورا کرے گی۔

میرا یہ فریضہ ہے کہ میں نصابی کمیٹی کے معزز اراکین کا فرداً فرداً شکریہ ادا کروں جن کے پرخلوص تعاون اور اشتراک کے بغیر اس کتاب کی ترتیب وتدوین کا کام ممکن نہ تھا۔میں DTERT کے ڈائرکٹر جناب پرومال سوامی کا ممنون ومشکور ہوں کہ آپ نے اردو ٹیچر ٹریننگ کے سال اوّل اور دوم کے لئے اردو زبان کی نصابی کتابیں تیار کرنے کی اجازت دیتے ہوئے ہمیں خصوصی سہولتیں بھی مہیّا کیں۔

آخر میں ان تمام مصنفین اور اہل قلم حضرات کا منّت کش احسان ہوں جن کی کتابوں سے ہمیں اخذ واستفادہ کرنے کا موقع نصیب ہوا۔

ڈاکٹر سیّد سجاد حسین
چیر پرسن، نصابی کمیٹی

ترانۂ اُردو

ہندوستان کی بیٹی محبوب کُل جہاں کی
پہلی پسند ہے یہ ہر پیر و نوجواں کی
باقی اسی زباں سے ہیں رونقیں یہاں کی
ہے ہر زبان سے پیاری اردو زباں ہماری
اردو زباں ہماری ۔ اردو زباں ہماری

آغوشِ مادری میں سیکھا ہے ہم نے اس کو
دل کا لہو پلاکر پالا ہے ہم نے اس کو
سانچے میں دوستی کے ڈھالا ہے ہم نے اس کو
ہم سب کی ہے دلاری اردو زباں ہماری
اردو زباں ہماری ۔ اردو زباں ہماری

سب کی پسند ہے یہ ہر دل کی جستجو ہے
چرچا اسی زباں کا دنیا میں کو بہ کو ہے
پھولے پھلے ہمیشہ ہم سب کی آرزو ہے
پھولوں کی جیسے کیاری اردو زباں ہماری
اردو زباں ہماری ۔ اردو زباں ہماری

شاہوں کے تاج میں تھی جتنا کے راج میں ہے
ہر ملک میں ہے زندہ سارے سماج میں ہے
ہندوستاں کے ہر اک رسم رواج میں ہے
ہے ہر زباں پہ جاری اردو زباں ہماری
اردو زباں ہماری ۔ اردو زباں ہماری

جاتی نہیں یہ دل سے جب دل میں بیٹھ جاتی
دوری نہیں بڑھاتی قربت نہیں مٹاتی
جھگڑا نہیں کراتی نفرت نہیں سکھاتی
اک طرزِ انکساری ، اردو زباں ہماری
اردو زباں ہماری ۔ اردو زباں ہماری

یہ کامیاب ہوکر نکلی ہر امتحاں سے
اس کو مٹانے والے مٹ جائیں گے جہاں سے
گر چھوڑ دو گے اس کو پاؤ گے پھر کہاں سے
کرتی ہے سب سے یاری اردو زباں ہماری
اردو زباں ہماری ۔ اردو زباں ہماری

کہتے ہیں لوگ اس سے روزی ہے اور نہ روٹی
اپنوں کے دیس میں ہی اپنوں کے درمیاں ہی
حق اپنا مانگتی ہے چاہت کی ہے یہ پیاسی
پھرتی ہے ماری ماری اردو زباں ہماری
اردو زباں ہماری ۔ اردو زباں ہماری

جائے پناہ مانگے جینے کی راہ مانگے
تھوڑی امان مانگے تھوڑی سی چاہ مانگے
اپنوں کی دشمنی سے ہر دم پناہ مانگے
میری ہے نہ تمہاری اردو زباں ہماری
اردو زباں ہماری ۔ اردو زباں ہماری

آتی ہیں یہ دعائیں ہونٹوں پہ میرے ہر دم
یارب مری زباں کا چرچا ہو عالم عالم
باقی رہے ہمیشہ سارے جہاں میں اسلم
سب بولیں باری باری اردو زباں ہماری
اردو زباں ہماری ۔ اردو زباں ہماری

حکیم محمد یعقوب اسلم عمری، ایم۔اے

نصاب Syllabus

اُردو زبان کی تدریس Teaching of Urdu

تعارف:

انسانوں اور حیوانوں میں بنیادی فرق زبان کا ہے مادری زبان ترسیل وابلاغ کا بہترین ذریعہ ہے اور اسی سے تہذیب کی شناخت ہوتی ہے۔ایک مہذب انسان کے بنانے میں مادری زبان کی تدریس اہم رول ادا کرتی ہے۔دیگر علوم کو سیکھنے میں بھی زبان ہی بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔زبان کی تعلیم چونکہ صلاحیتوں پر مبنی ہے۔ اس لئے یہ دوسرے علوم سے مختلف ہے جو بیشتر متن پر مبنی ہوتے ہیں۔زبان کی تعلیم میں صلاحیتوں کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔جبکہ دوسرے علوم میں معلومات کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔متعلّم اساتذہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی مادری زبان میں ہی زیادہ سے زیادہ صلاحیتیں پیدا کر سکتے ہیں۔متعلّم اساتذہ خاص طور پر اُردو زبان کی تعلیم وتدریس کے سلسلے میں کوشاں رہیں تا کہ اُردو زبان کی اہمیت وافادیت ان پر پوری طرح واضح ہو جائے۔

اُردو تدریس کے مقاصد:

متعلم استاد کو حسبِ ذیل باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے۔

☆ ماحول اور موضوع کے مطابق زبان کا استعمال۔

☆متعلم استاد کو پانچویں جماعت تک کے نصاب سے بھرپور واقفیت ہونی چاہئے اور دسویں جماعت کے نصاب سے جزوی واقفیت کارآمد ثابت ہوگی۔

☆ متعلم استاد کے اندر پانچویں جماعت تک کے نصاب کو پڑھانے کی صلاحیت ہونی چاہئے۔

☆متعلم استاد کو چاہئے کہ وہ طلباء اور طالبات کے اندر بولنے، سننّے ، پڑھنے اور لکھنے کی صلاحیتیں پیدا کرنی چاہئے۔

☆ متعلم اُستاد تحریری اور تکلمی زبان کے بنیادی حروف سے واقف ہونا چاہئے۔

☆متعلم اُستاد کو سبق کی تیاری کا منصوبہ بنانا ہوگا اور اس کا صحیح استعمال کرنا ہوگا۔

☆متعلم اُستاد اپنے عملی کام کے ذریعے لفظیات کے ذخیرہ میں اضافہ کر سکتے ہیں۔

☆ متعلم اُستاد پڑھنے اور پڑھانے کے لئے امدادی سامان تیار کریں اور اُس کا ٹھیک استعمال کریں۔

☆ متعلم اُستاد درسی کتابوں کا تجزیہ کریں۔

☆ متعلم اُستاد مختلف طرح کے سوالات ترتیب دیکر نمونۂ سوالات تیار کریں۔جس سے اُردو زبان میں صلاحیتوں کی جا سکے۔

☆ متعلم اُستاد طلباء اور طالبات کی غلطیوں کی نشاندہی کریں اور اُس کے ازالہ کی تدبیر بتائیں۔

سال اوّل

حصّۂ اوّل۔اُردو زبان کی صلاحیتیں

I شاعری

دسویں جماعت تک کی درسی کُتب میں شامل حصّہ شاعری سے متعلق جانکاری حاصل کرنا۔

<u>غزل</u> ا۔ غزل کی تعریف (ب) غزل کا موضوع (ج) غزل کی ہئیت اور ساخت یا غزل کا فن (د) غزل کی تدریس (ھ) غالبؔ (و) مومنؔ (ز) جگر مرادآبادی (ح) حسرتؔ موہانی

<u>مرثیہ</u> (ا) مرثیہ کی تعریف (ب) مرثیہ کے موضوعات (ج) مرثیئے کے اجزائے ترکیبی (د) مرثیئے کی تاریخ (ھ) مرثیہ کی تدریس (و) میرؔ انیس (ز) مرزا دبیرؔ

<u>مثنوی</u> (ا) مثنوی کی تعریف (ب) مثنوی کے موضوعات (ج) مثنوی کی ہئیت اور ساخت یا مثنوی کا فن (د) میر حسنؔ

II نثر

بیسویں صدی کے ادیبوں کی تصانیف کو پڑھکر اُس کے موضوع سے متعلق جانکاری حاصل کریں اور اس کی لفظیات واسلوبِ نگارش کے محاسن اُجاگر کریں۔

<u>داستان</u>

ا۔داستان کی تعریف

ب۔ داستان کی خصوصیات

ج۔ اردو داستان کی تاریخ

III قواعد

ا۔لفظ کی تعریف اور اُس کی قسمیں

ب۔اسم کی تعریف اور اس کی قسمیں

ج۔ضمیر اور اس کی قسمیں

د۔لوازمِ اسم کے تحت واحد اور جمع

IV تخلیقی صلاحیتیں

ا۔ذیل میں دیئے گئے کہانی کے نکات پڑھ کر کہانی مکمل کیجئے۔

ب۔ذیل میں دیئے گئے مکالمے کے نکات کو غور سے پڑھئے اور مکالمہ نگاری مکمل کیجئے۔

ج۔مضمون نگاری

نوٹ:۔اس حصے میں متن پر سوالات نہیں پوچھے جائیں گے بلکہ زبان کی صلاحیت پر مبنی سوالات ہوں گے۔۔۔

(حصہ دوم) اُردو زبان کی تدریس کے طریقۂ کار

نمبر	عنوان	عملی کام
V	**اُردو زبان کی خصوصیات**	
	۔تکلمی اور تحریری زبان	جنس کے تعلق سے کچھ مثالیں
	۔اُردو زبان کا آغاز اور ارتقائاورزبان سکھانے کے قاعدے	دیں۔
	روایات کی پاسداری	
	۔اُردو زبان اور ادب کا جمالیاتی شعور	
	زبان اور قواعد کے اصول	
	۔زبان اور سماج	
	۔ زبان سے متعلق ذہنی روّیہ اور اُس کی ترغیب	

- زبان کی شناخت
- زبان اور جنس کے مسائل
- زبان اور اس کا استعمال
- زبان کے ذریعے ایک ذمہ دار شہری بنانا

تعلیمی سرگرمیاں

VI زبان کی تدریس

- صلاحیت ابھارنے والے اسباق
- زبان کی تعلیم اور زبان کے ذریعہ تعلیم
- زبان سے واقفیت اور زبان کا سیکھنا
- مادری زبان پہلی زبان
- مدرسے کو آنے والے طلباء میں زبان کی صلاحیت

زبان کے استعمال اور روزمرہ سے متعلق طلباء کو مثالوں کے ساتھ سمجھانا

طلباء کو تحریری زبان سے متعارف کرانا

ڈرامے کی تدریس

VII لسانیات اور صوتیات

لسانیاتی اور تعلیمی سرگرمیاں

VIII بنیادی اور اعلیٰ صلاحیتیں

سننا، بولنا، پڑھنا اور لکھنا

سننا

عملِ سماعت کے اجزاء

تلفظ

سننے کی صلاحیتوں کو فروغ دینا

سماعت کی موثر تدریس
سننے کی مشق
بولنا
بولنے کی قسمیں
درس وتدریس کی مہارتیں
تدریسی سرگرمیوں کی منصوبہ بندی
پڑھنا
خاموش مطالعہ
بلند خوانی
مطالعے کے تدریسی طریقے
لکھنا
تحریر کے اُصول
IX مبنی برعمل اکتساب
عمل کے ذریعے سیکھنے کے مدارج
بنیادی عمل سے سیکھنے کے امدادی اشیاء
مبنی برعمل کی اکتساب کا آغاز
اردو زبان سکھانے کے دوران استعمال ہونے والے نشانات
X سبق کی تدریس کا منصوبہ اور تعلیمی سرگرمیاں سبق کی منصوبہ بندی کی اہمیت
سبق کی منصوبہ بندی کی عمدہ خصوصیات، پہلی جماعت سے چوتھی جماعت تک کی منصوبہ بندی۔۔۔۔۔۔۔
پانچویں جماعت کے سبق کا منصوبہ
تعلیمی سرگرمیاں

XI اُردو زبان کی تدریسی صلاحیتوں میں اضافہ

تعارف - سیکھنے کے نتائج- مشاہدے کی اہمیت- انعکاسی اظہار- روایتی طریقہ تدریس کا مشاہدہ - عملی اکتسابی طریقۂ کار کا مشاہدہ - مشاہدے کا فارم پُر کرنا - مواد کو اکھٹا کرنے کی صلاحیت- حوالہ جاتی کتب- لغات - اُردو کے جدید لُغات - دائرۃ المعارف- متضاد الفاظ - ہم آواز الفاظ- واحد جمع - مذکر مونث - ضرب الامثال مع مطالب- محاورے مع مطالب- محاورے اور مطلب-

خاکے: ا۔ مشاہدے کا فارم- ب۔ مشاہدے کے تاثرات

ج۔ مبنی بر عمل اکتساب کا خاکہ

د۔ روایتی تدریس کا خاکہ

عملی سرگرمیاں

متعلم اساتذہ کی زیر تربیت مدت کے دوران ہر روز اُن کے لئے سیکھنے کا دن ہوتا ہے۔ ہر کلاس میں عملی سرگرمیاں شامل ہوتی ہیں۔ ان عملی سرگرمیوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے تمام متعلم اساتذہ کو چاہئے کہ وہ عملی سرگرمیوں کو انجام دیں۔ ذیل میں ہر سبق سے جُڑی عملی سرگرمی کی نشاندہی کی گئی ہے۔

مذکورہ سرگرمیوں کے علاوہ حسبِ ذیلی سرگرمیوں کو بھی انجام دینا چاہئے۔ جو نصاب میں داخل ہیں۔ متعلم اساتذہ کو مواد کی فراہمی کتابوں کے نام اور ضروری ماخذ کی نشاندہی کرتے ہوئے عملی سرگرمیوں کو انجام دینے میں طلبہ کی رہنمائی کرنی چاہئے۔

حصّہ اوّل

ابواب	عملی سرگرمیاں
باب ا	مترنم الفاظ کو یکجا کرنا
نظم	لفظوں کو علیٰحدہ کرنا۔ نظم کے اُصول ظاہر کرنا
	نظم کی شعری اصطلاحات کا مفہوم سمجھانا
	نظم کا مرکزی خیال واضح کرنا

نظم کا تنقیدی تجزیہ کرنا۔ لغات کا استعمال

باب II نثر — نظم کو نثر میں ڈھالنا

ادیبوں کے خیالات کی تحسین کرنا

تشبیہ اور استعارات کا استعمال، ضرب الامثال اور محاورے ترتیب دینا، لغات کا استعمال

باب III — قواعد کے اُصولوں کو تحریر کرنا۔ - کتب خانہ سے حوالا جاتی کتب کی فہرست تیار کرنا

قواعد — نظم و نثر کے تحت قواعد کے اُصول بتانا۔ اور اُس کے مطالعہ کی نشاندہی کرنا۔

-اپنے تیار شدہ مشاہدے کی وضاحت کرنا

لفظوں کا محلِ استعمال۔ ادبی مضامین کو قواعد کے اُصولوں کے تحت واضح کرنا۔

باب IV — مضمون نگاری۔ مضمون کو مکالموں میں ڈھالنا

تخلیقی صلاحیتیں — مکالموں کو اخبار میں ڈھالنا

حصّہ دوم

باب V — کہاوتوں کو ترتیب دینا

اُردو زبان کی خصوصیات — بول چال کے الفاظ اور ٹکسالی الفاظ کو ترتیب دینا۔

علاقائی کہاوتوں اور روایتی محاوروں کو ترتیب دینا۔

اردو الفاظ کو اکٹھا کرنا اور انکا محل استعمال دوسری زبانوں میں ظاہر کرنا

الفاظ کی جنس ظاہر کرنا۔ ضمیروں کو اکٹھا کرنا

دوسری زبانوں کے الفاظ کو ترتیب دینا جو اردو زبان میں مروج ہیں۔ ان کے لئے

مناسب اردو الفاظ کو تلاش کرنا جیسے تکنیکی۔ ٹکٹ وغیرہ

باب VI — کسی عنوان پر فی البدیہہ تقریر کرنا

زبان کی تدریس — زبان کی ادائیگی اور عملی اظہار

تدریس کے مختلف طریقوں پر مشتمل ریکارڈ تیار کرنا

زبان کی تجربہ گاہ کا نقشہ ترتیب دینا

باب VII عملی لسانیات اور صوتیات — علم صرف، علم نحو، علم معانی کے حوالے سے عملی لسانیات اور صوتیات کے ماخذ کا ریکارڈ تیار کرنا

باب VIII بنیادی اور اعلیٰ صلاحیت — بچوں کے لئے کہانیاں اور گیت ترتیب دینا

کلاس میں مخصوص عنوانات پر مکالمہ اور لسانی کھیل ترتیب دینا۔

لسانی کھیلوں پر مشتمل ریکارڈ تیار کرنا۔ زبان توڑ جملے

گیت گانا۔ خبریں پڑھنے کی مشق کرانا

جذبات کے اظہار کے ساتھ کہانیاں کہنا۔ روزنامچہ (ڈائری) لکھنا

روزانہ کی کاروائیوں کا ریکارڈ تیار کرنا

سننے (سماعت) اور لکھنے (تحریر) کے لئے اقتباس تیار کرنا۔

باب IX مبنی برعمل اکتساب — مبنی برعمل اکتساب (ABL) کے کارڈس تیار کرنا

حروف تہجی کے اعتبار سے الفاظ ترتیب دینا۔

ہمہ جہتی تدریس کے لئے سبق کی منصوبہ بندی کرنا

تصویری آلبم تیار کرنا۔ اشتہار تیار کرنا

باب X سبق کی تدریس کی منصوبہ بندی اور تعلیمی سرگرمیاں — سبق کے منصوبہ کا ریکارڈ تیار کرنا

تدریسی نوٹس کا ریکارڈ تیار کرنا

تدریسی اور اکتسابی مواد تیار کرنا

اکتسابی گوشوں کا نقشہ تیار کرنا

باب XI اُردو زبان کی تدریسی صلاحیتوں میں اضافہ — متضاد الفاظ، ہم معنی الفاظ، ہم صوتی الفاظ، تشبیہات، محاورے، ضرب الامثال مع مطالب کا ریکارڈ تیار کرنا

نمونے کے فارم پُر کرنا

فہرستِ مضامین

باب
صفحہ نمبر

حصّہ اوّل
اُردو زبان کی صلاحیتیں

I نظم
II نثر
III قواعد
IV تخلیقی صلاحیتیں

حصّہ دوّم
اردو زبان کی تدریس کے طریقۂ کار

V اُردو زبان کی خصوصیات
VI زبان کی تدریس
VII لِسانیات اور صوتیات
VIII بنیادی اور اعلیٰ صلاحیتیں
IX مبنی بر عمل اکتساب
X سبق کی تدریس کا منصوبہ اور تعلیمی سرگرمیاں
XI (i) اردو زبان کی تدریسی صلاحیتوں میں اضافہ
(ii) متضاد الفاظ
(iii) ضرب الامثال مع مطالب
(iv) محاورے مع مطالب
(v) خاکے
(vi) سوالات کے پرچے کا خاکہ
(vii) سوال کا پرچہ
(viii) ضمیمہ
(ix) کتابیات

سالِ اوّل

حصّہ اوّل۔اُردو زبان کی صلاحیتیں

I-Poetry ۔باب ا نظم

شاعری

شاعری ایک ذوقی اور وجدانی چیز ہے۔ذیل میں کچھ اشارات درج کئے جاتے ہیں۔جن کی مدد سے اس کا مفہوم کسی حد تک ذہن میں جاگزین ہو سکے گا۔

۱۔ شاعری۔نام ہے انسانی تجربات خیالات اور جذبات کے اظہار کا۔

۲۔ شاعری۔کہتے ہیں موزوں الفاظ میں حقائق کی تصویر کشی کو۔

۳۔ بقول میتھو آرنلڈ۔ شاعری، زندگی کی تفسیر ہے اور تفسیر یا ترجمانی میں شعریت اس وقت پیدا ہوتی ہے۔جب اس میں تخیّل اور جذبات دونوں موجود ہوں۔

۴۔ شاعری۔ادب کی سب سے زیادہ مقبول صورت ہے۔

۵۔ بقول شیلے۔شاعری، تہذیب، آئین اور مختلف علوم وفنون کا سرچشمہ ہے۔

۶۔ شاعری۔موزوں الفاظ میں جذباتِ قلبی کے اظہار کا نام ہے۔

۷۔ سر فلپ سڈنی کا قول ہے کہ شاعری جملہ علوم وفنون کی دایہ ہے۔

۸۔ بقول کیٹس۔شاعری ہمیں انتہائی درجہ کی حیرت سے ہم آغوش کر دیتی ہے۔

۹۔ بقول شبلی۔شاعری وہ فن ہے جس کی بدولت شاعر دوسروں کے جذبات اور احساسات برانگیختہ کر سکتا ہے۔

۱۰۔ شاعری وہ ملکہ فطری ہے جس کی بدولت ایک شخص معمولی سی بات کو ایسے مؤثر اور دلکش انداز میں ادا کر سکے۔جسے سن کر ہر صاحبِ دل بے اختیار تڑپ اُٹھے۔اور وہ شعر بلا کوشش اس کے صفحۂ دل پر نقش ہو جائے مثلاً ایک عاشق جو شاعر نہیں ہے، معشوق سے اپنے اتصالِ روحانی کی کیفیت زیادہ سے زیادہ ان لفظوں میں بیان کرے گا۔

''آپ میری حقیقت ہیں''

لیکن ایک شاعر اسی بات کو (جسے سُن کر سامع پر کوئی کیفیت طاری نہیں ہوئی) اس دلکش انداز میں ادا کر دے گا۔

کہئے کہ اب میں اپنی حقیقت کو کیا کہوں
جو سانس لی وہ آپ کی تصویر ہوگئی

ا۔غزل کی تعریف: غزل سے مراد، شعروں کا وہ سلسلہ ہے جو

ا۔ ایک ہی ردیف، قافیے اور بحر میں کہے گئے ہوں۔

۲۔ معنیٰ اور کیفیت کے لحاظ سے ہر شعر مکمل ہو۔

۳۔ طرزِ احساس اور اندازِ بیان کے اعتبار سے داخلیت سے عبارت ہو۔

۴۔ مخصوص لفظیات اور علامتوں میں لکھے گئے ہوں۔

غزل ہماری شاعری کا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔غزل اردو شاعری کی آبرو ہے۔ ہماری تہذیب غزل میں اور غزل ہماری تہذیب میں ڈھلی ہے۔دونوں کو سمت و رفتار، رنگ و آہنگ وزن و وقار ایک دوسرے سے ملا ہے۔یہی سبب ہے کہ ہماری تہذیب کی روح غزل میں اور غزل کی روح ہماری تہذیب میں بے نقاب نظر آتی ہے۔

اردو غزل کی ڈھائی سو سالہ روایت میں ہماری زندگی کا قافلہ جن راہوں سے بھی گذرا ہے ہماری تہذیب جن منزلوں سے بھی روشناس ہوئی ہے اس کی سچی اور صحیح تصویر ہماری غزل میں ملتی ہے۔اسی عرصے میں ہم نے جو کچھ بھی محسوس کیا ہے، جو کچھ بھی سوچا ہے، جو تصورات بھی قائم کئے ہیں، جن نظریات کی بھی تشکیل کی ہے، ان سب کی صحیح آئینہ داری جیسی غزل نے کی ہے۔شاید ہی کسی اور صنف ادب نے کی ہو۔

اصطلاحی معنوں میں غزل کو وارداتِ قلبی اور کیفیاتِ عشق کا نام دیا جاتا ہے۔غزل کی شاعری بڑی حد تک داخلی شاعری ہے یعنی شاعر اپنے موضوع کی تلاش خود اپنی ذات میں کرتا ہے۔غزل میں حد درجہ کی درون بینی پائی جاتی ہے۔یعنی غزل گو شاعر جو کچھ کہتا ہے وہ دل کی گہرائیوں سے کہتا ہے، اسی لئے غزل کے اندرونی تجربوں کے دل کش انداز کے اظہار کا نام ہے۔

ب۔ غزل کا موضوع: غزل کا سب سے اہم موضوع عشق ہے تمام غزل گو شعراء نے عشق ہی کی کیفیت کا بیان کیا ہے، مگر ہر شاعر کی افتادِ طبع، طرزِ فکر اور واردات قلبی کی نوعیت ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہے۔اسی لئے موضوع

کی یکسانیت کے باوجود ہر شاعر کا رنگ دوسروں سے جدا ہوتا ہے۔حسرتؔ موہانی ، فانیؔ بدایونی ، اصغرؔ گونڈوی اور جگر مرادآبادی چاروں غزل گو شاعر ہیں لیکن ہر ایک کا اسلوب بیان الگ ہے ۔

ہر گلے را رنگ دبوئے دیگر است

غزل کا سب سے اہم عنصر اس کا ایہام واجمال ہے اور غزل کی یہی جان ہے ایہام کو رمز وایما بھی کہتے ہیں ۔ کیونکہ غزل میں حسن وعشق کی داستان ایمائی انداز میں بیان کی جاتی ہے۔ چونکہ غزل میں تفصیل یا توضیح کی گنجائش نہیں ہوتی۔اس لئے شاعر مجبور ارمز وایما سے کام لیتا ہے۔غالب کہتے ہیں ۔

مقصد ہے نازوغمزہ ولے گفتگو میں کام
چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر

ج۔ غزل کی ہئیت اور ساخت یا غزل کا فن:

غزل چونکہ داخلی صنف سخن ہے اور اس میں شاعر زیادہ تر کیفیات عشق اور واردات قلبی کی ترجمانی کرتا ہے۔اس لئے غزل کی شاعری بعض اوقات غیر شعوری طور پر فلسفیانہ اور متصوفانہ شاعری بن جاتی ہے۔ چنانچہ بیدلؔ،خواجہ میر دردؔ، غالبؔ ، اقبالؔ اور اصغرؔ کا کلام اس حقیقت پر شاہد عادل ہے۔اسی لئے ناقدین فن کا نظریہ ہے کہ غزل شاعری کی شریف ترین اور پاکیزہ ترین صنف ہے۔غزل کی دلکشی کا دارومدار زیادہ تر انداز بیان پر ہے۔اسی کو طرفگی ادا بھی کہتے ہیں اسی انداز بیان کی بدولت غزل میں تغزل پیدا ہوتا ہے۔جس کو بلاشبہ غزل کی روح کہہ سکتے ہیں۔غزل اور تغزل لازم وملزوم ہیں۔اگر غزل میں تغزل نہ ہوتو وہ جسم بے روح سمجھا جائے گا جسے ''موج زندگی'' بھی کہتے ہیں۔وہ اسی تغزل کی بدولت پیدا ہوتی ہے۔

اصغرؔ غزل میں چاہئے وہ موجِ زندگی
جو حسن ہے بتوں میں جو مستی شراب میں

غالبؔ نے غزل میں محبوب کو بلائے جان قرار دیا ہے۔اور اس کی شاعرانہ نظر نے اس کو تین اجزاء میں تقسیم کیا ہے۔

بلائے جاں ہے غالب اس کی ہر بات
عبارت کیا، اشارت کیا، ادا کیا

یہی تینوں اجزاء تغزل کے اصلی عناصر ہیں غزل محبوب سے اور محبوب کی گفتگو ہے۔اس کی خوبی تاثیر میں منحصر ہے کیونکہ انسان کی ہر بات کا مقصد یا تو اطلاع دینا ہے یا اثر پیدا کرنا ہے، اول الذکر مقصد کے لئے نثر کافی ہے۔لیکن آخر الذکر مقصد کے لئے شاعری وجود میں آئی اس لئے شعر کا سرمایہ تاثیر کے خمیر سے بنتا ہے۔

غزل میں اشعار کی تعداد زیادہ سے زیادہ اکیس ہوتی ہے اور کم سے کم غزل میں پانچ شعر ہوتے ہیں۔غزل کے پہلے شعر کو مطلع کہتے ہیں۔جس میں دو مصرعے قافیہ اور ردیف کے ساتھ پیش کئے جاتے ہیں۔

درد منت کش دوا نہ ہوا

میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا

مطلع کے دونوں مصرعے ہم وزن ہوتے ہیں اور ان میں قافیہ اور ردیف کی پابندی کی جاتی ہے غزل میں قافیہ ہم وزن الفاظ کو کہتے ہیں جو غزل کے ہر دوسرے مصرعے میں لائے جاتے ہیں۔مثال کے طور پر مذکورہ شعر میں لفظ دوا اور برا قافیہ ہیں۔اسی طرح غزل کے ہر دوسرے مصرعے میں قافیہ اسی وزن پر لایا جاتا ہے۔جیسے یہ شعر

جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو

اک تماشا ہوا گلہ نہ ہوا

ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں

تو ہی جب خنجر آزمانہ ہوا

ان اشعار میں گلہ اور آزما قافیہ ہیں اور جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے کہ قافیے غزل کے ہر دوسرے مصرعے میں لائے جاتے ہیں۔غزل میں قافیہ کے بعد جو الفاظ آتے ہیں ان کو ردیف کہا جاتا ہے۔ردیف وہ مکرر الفاظ ہیں جو پوری غزل میں استعمال ہوتے ہیں۔اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی ہے۔مثلاً

درد منت کشِ دوا نہ ہوا

میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا

اس شعر میں قافیہ کے بعد 'نہ ہوا' کے الفاظ دہرائے گئے ہیں اور پوری غزل میں بلا کسی تغیر کے 'نہ ہوا' کی ردیف استعمال ہوتی ہے۔

غزل میں جہاں شاعر کا تخلص استعمال ہوتا ہے۔اس شعر کو مقطع کہیں گے۔مقطع کے معنی ہیں کاٹ دینے کے یعنی مقطع کے بعد غزل ختم ہو جاتی ہے۔عموماً شاعر حضرات اپنی غزلوں میں تخلص غزل کے آخری شعر میں استعمال کرتے ہیں۔مثال کے طور پر غالبؔ کا یہ مقطع ملاحظہ کیجئے۔

کچھ تو پڑھئے کہ لوگ کہتے ہیں
آج غالبؔ غزل سرا نہ ہوا

اگر ایک غزل میں ایک سے زیادہ مطلع کے شعر استعمال ہوں تو ایسی غزل کو ذوالمطلعین کہتے ہیں۔

د۔ غزل کی تدریس: غزل کا لفظ عربی ہے اور عشق و رومان کے معاملات کے لئے استعمال ہوتا ہے۔عربی قصیدہ کے اسی ابتدائی حصّے کو غزل (یا تشبیب) کہا جانے لگا جس میں عشق اور شباہیات کے مضمون باندھے جاتے ہیں۔ اور شاعر محبوبہ کے ساتھ گذارے ہوئے لمحوں کو یاد کرتا تھا۔جب عربی قصیدہ ایران پہنچا اور فارسی میں اسی طرز پر قصیدے لکھے جانے لگے تو کچھ ہی دنوں میں قصیدے کا یہ حصہ ایک علٰحدہ صنف ہی بن گیا اور عشقیہ مضامین کے لئے مخصوص ہو گیا۔اس کی اپنی علامتیں اور لفظیات وضع ہونے لگیں اور غزل ایک مستقل صنف بن گئی۔

غزل کی مخصوص لفظیات اور تمثیلی علامتیں اس کی کمزوری بھی ہیں اور اس کی طاقت بھی۔اسی لئے غزل پڑھاتے وقت یہ بات بار بار واضح کرنی چاہئے کہ غزل کی علامتوں کو لغوی معنی میں سمجھنا بڑی غلطی ہے۔گل کے معنی یہاں محض گلاب کے پھول کے نہیں ہیں۔اسی طرح بلبل کے معنی کسی پرندے کے نہیں ہیں بلکہ ان علامتوں کے پیچھے زیادہ گہری حقیقتیں چھپی ہوئی ہیں اور گل و بلبل کی علامتوں کے ذریعے انسانوں کے باہمی رشتوں کی کہانیاں بھی کہی گئی ہیں اور سیاست کی چیرہ دستیوں کا بیان بھی ہوا ہے۔

غزل کی بلند خوانی کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی بتانی ہوگی کہ غزل چھوٹی چھوٹی تصویروں سے مرقع سجانے کا آرٹ ہے۔اس لئے غزل کے لفظ کی آڑ میں معنی، مفہوم اور کیفیت کی پوری دنیا چھپی ہوتی ہے۔اردو غزلوں کا پورا سرمایہ صرف عشق و عاشقی کے مضامین یا گل و بلبل کے قصّوں ہی سے بھرا ہوا ہے اور اس میں سنجیدہ فکر کی کمی ہے یہ اور بات ہے کہ اس پیرائے کو اختیار کر لیا گیا ہے مگر باتیں ہر طرح کی ادا ہوئی ہیں۔ اخلاق، سیاست، فلسفہ، انسانی رشتوں کی پیچیدگیاں، روزمرہ کی زندگی کی جھلکیاں، زبان کے چٹخارے، گفتگو کی چاشنی، نشاط، زیست اور غم روزگار، سبھی کچھ ان علامتوں میں

ڈھالا گیا ہے۔شرط ہے تو صرف اتنی کہ آہنگ داخلی رہے اور ذاتی احساس اور نجی سرگذشت کے لہجے میں سما جائے اور غزل کا پیرایۂ اظہار مجروح نہ ہو۔

اب غزل کی بلند خوانی کے بعد متن کی طرف توجہ کیجئے اسی سلسلے میں اہم بات وہی ہے کہ ہر شاعر کا مرکزی لفظ طے کرلیا جائے اور اسی کو پیش نظر رکھکر شعر کے مطلب کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔

اگر کوئی ایسی غزل پڑھانی مقصود ہے جو اخلاق وموعظت اور پند ونصیحت کے مضامین پر مشتمل یا دور جدید کے فکری میلانات کی حامل ہے۔تو یہ سوال اٹھایا جاسکتا ہے کہ اولاً اور اصلاً غزل کس نوع کے مضامین کے لئے وقف تھی پھر بعد کے شعرا نے ان کو کن اضافوں یا جدّتوں کا مورد بنایا اور اب موجودہ دور کے ذہنی وادبی تحریکات نے اس کو کس تغیرات سے آشنا کیا ہے اگر کسی رجائی شاعر کا کلام زیر تدریس ہے تو رجائیت وقنوطیت کے مسئلے سے تعرض کرکے اردو کلام کے عام مشایم انداز کو زیر غور لایا جاسکتا ہے۔غرض یہ کہ غزل سے متعلق ان گنت امور وسائل ایسے ہیں۔جن سے ہم رجوع کرسکتے ہیں اور غزل کے اسباق میں تمہیدی پس منظر کا کام لے سکتے ہیں۔

یہاں سب سے پہلے زیر تدریس غزل کی تعارفی بلند خوانی ہونی چاہئے۔جو بعض حالات میں ایک سے زیادہ مرتبہ بھی کی جاسکتی ہے اور جس کا مقصد ظاہر ہے۔یہ ہوگا کہ طلباء کو غزل کی نوعیت اور مفہوم کا سرسری اندازہ ہوجائے (بعض اوقات خصوصاً مسلسل غزلوں کے پڑھانے میں بلند خوانی سے پہلے ایک مختصر سی تمہیدی گفتگو بھی ضروری ہوتی ہے۔جس کی مدد سے غزل کے مرکزی خیال اور بعض دوسرے پہلوؤں کی طرف اشارے کئے جاسکیں اور غزل کی تدریس کے لئے ایک مناسب پس منظر فراہم کیا جاسکے) بلند خوانی کے خصوص میں یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ غزل یا نظم کی تعلیم میں بلند خوانی کی اہمیت ناقابل بیان ہے ہم کہہ سکتے ہیں کہ کسی نظم یا غزل کے مطالعے سے طلباء جو فائدہ اُٹھائیں گے یا اُٹھاسکیں گے۔اس کا انحصار دراصل استاد کی بلند خوانی کی نوعیت پر ہے۔

تعارفی بلند خوانی کے بعد اگلا قدم مختلف اشعار کی تشریح کی توضیح ہوگی۔چنانچہ مطالب کے بارے میں سوالات کئے جائیں اور سوالات وجوابات کے دوران نہ صرف اشعار کے مفہوم کی توضیح کی جائے بلکہ اور ایک ثانوی عمل کے طور پر مشکل الفاظ وغیرہ کی تشریح کچھ اس طرح ہونی چاہئے کہ وہ توضیح مطالب نظم موضوعات اور ہیئتوں کے لحاظ سے اس قدر متنوع اور ہمہ گیر صنف ہے کہ اس کے ساتھ کسی ایک یا چند موضوعات کو مخصوص نہیں کیا جاسکتا۔زندگی کے ہر واقعہ ہر

واردات ہر مہر، ہر جذبہ، ہر احساس ہر کیفیت کو نظم کا موضوع بنایا جا سکتا ہے۔

ذیل میں چند مشہور غزل گو شعراء کا تعارف پیش کیا جا رہا ہے۔

مرزا غالبؔ (۱۷۹۷ء - ۱۸۶۹ء)

غالبؔ کا اصل نام مرزا اسد اللہ بیگ خان تھا۔ مرزا نوشہ عرف تھا۔ اور ''نجم الدولہ دبیر الملک اسد اللہ خان بہادر نظام جنگ'' خطاب تھا۔ باپ کا نام مرزا عبید اللہ بیگ تھا۔ مرزا بیگ کی شادی آگرہ میں مرزا غلام حسین خان کی بیٹی عزت النساء بیگم سے ہوئی تھی۔ انھیں کے بطن سے غالبؔ پیدا ہوئے۔ تاریخ ولادت ۲۷ر دسمبر ۱۷۹۷ء ہے۔

غالب بچپن ہی میں یتیم ہو گئے تھے۔ اس لئے ان کی پرورش ان کے چچا مرزا نصر اللہ بیگ خان نے کی۔ لیکن جب وہ آٹھ سال کے ہوئے تو چچا بھی فوت ہو گئے۔ مرزا غالب نے ابتدائی تعلیم آگرہ کے مشہور عالم مولوی محمد معظم صاحب سے حاصل کی۔ مرزا غالبؔ کے اخلاق نہایت وسیع تھے۔ وہ ہر ایک شخص سے جو ان سے ملنے جاتا تھا بہت کشادہ پیشانی سے ملتے تھے۔ اور دوستوں کو دیکھ کر باغ باغ ہو جاتے تھے۔

مروت اور لحاظ مرزا غالبؔ کی طبیعت میں بدرجۂ اتم موجود تھا۔ اگر چہ کہ مرزا غالبؔ کی آمدنی قلیل تھی مگر حوصلہ بلند تھا۔ کوئی بھی سائل ان کے در سے خالی ہاتھ نہیں جاتا تھا۔ مرزا کی طبیعت میں استقلال تھا اور ذہن میں وسعت اور سمجھ داری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ان کا حافظہ بھی نہایت قوی تھا۔ غالب کے شعر کہنے کا طریقہ نرالا تھا۔ اکثر وہ رات میں شعر کہا کرتے تھے اور جب کوئی شعر انجام پا جاتا تھا تو کمر بند میں ایک گرہ لگا لیتے تھے۔ اس طرح آٹھ یا دس گرہیں ہو جاتیں تو سو رہتے تھے۔ اور دوسرے دن ان گرہوں کو کھول کر اشعار قلم بند کر لیتے تھے۔ شعر فہمی اور کتاب فہمی میں وہ ایک مستثنیٰ آدمی تھے۔ کیا ہی مشکل مضمون ہو اکثر ایک ہی سرسری نظر میں اس کی تہہ تک پہنچ جاتے۔ حائق اور معارف کی کتابیں اکثر مطالعہ کرتے تھے اور ان کو خوب سمجھتے تھے۔

مرزا کی تصنیفات: مرزا نے فارسی اور اردو نظم و نثر میں حسبِ ذیل تصانیف اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ جن کی بدولت انھیں بقائے دوام کی نعمت حاصل ہوئی اور دونوں زبانوں کے ادب میں بیش بہا اضافہ ہوا۔

قسم اوّل (فارسی نثر) ۱۔ پنج آہنگ : یہ کتاب پانچ حصّوں پر مشتمل ہے۔ آہنگ اول میں انقلابِ آداب۔ آہنگ دوم میں مصطلحات و لغات۔ آہنگ سوم میں اشعار منتخب از دیوانِ غالبؔ۔ آہنگ چہارم میں تقاریظ۔

آہنگ پنجم میں مکاتیب۔

قسم دوّم (فارسی نظم) ۱۔کلیات نظم فارسی: مرزا کا فارسی کلام میخانۂ آرزو کے عنوان سے ۱۸۳۵ء میں مرتب ہوا۔
۲۔دعائے صباح: عربی زبان میں جو دعاء الصباح، حضرت علیؓ سے منسوب ہے۔ یہ مثنوی جس میں ۱۲۱ اشعار ہین۔ مرزا کی زندگی میں لکھنوء سے شائع ہوئی تھی۔
۳۔متفرقات غالب: اس میں کچھ خطوط، کچھ نظمیں اور مثنوی باد مخالف جو مرزا نے کلکتہ میں لکھی تھی۔
قسم سوم (اردو نظم): ۱۔ دیوانِ اُردو: مرزا کو دراصل اپنے فارسی کلام پر ناز تھا۔جیسا کہ اس شعر سے ظاہر ہے۔

فارسی بیں تا ببینی نقشہائے رنگ رنگ
بگذر از مجموعہ اردو کہ بیرنگ من است

لیکن کرشمۂ تقدیر دیکھو کہ ان کی شہرت اسی مجموعہ اردو کی بدولت ہوئی جس کو وہ ''بیرنگ'' کہتے ہیں۔
قسم چہارم (اُردو نثر): ۱۔ عود ہندی: یہ مرزا کے اردو خطوط کا مجموعہ ہے۔ ۲۔اردوئے معلّٰی: یہ بھی ان کے اردو خطوط کا مجموعہ ہے۔ ۳۔ مکاتیب غالبؔ: دربار رامپور سے مرزا کی خط و کتابت بارہ سال تک رہی۔مولانا امتیاز علی خان صاحب عرشی ناظم کتب خانۂ ریاست رامپور نے ان تمام خطوط کو ''مکاتیب غالب'' کے نام سے پہلی مرتبہ ۱۹۳۷ء میں شائع کیا۔
۴۔ نادرات غالبؔ: یہ ان خطوط کا مجموعہ ہے جو مرزا نے اپنے دوست منشی بنی بخش حقیر کے نام لکھے تھے۔
۵۔ نکات غالبؔ و رقعات غالبؔ: نکات غالبؔ میں فارسی حرف کے قواعد اردو میں لکھے تھے اور رقعات میں اپنے پندرہ فارسی مکتوب، پنج آہنگ سے منتخب کر کے درج کئے تھے۔
۶۔ قادر نامہ: عارف کے بچوں کے لئے مرزا نے آٹھ صفحہ کا یہ مختصر رسالہ تصنیف کیا تھا۔جس میں خالق باری کی طرز پر فارسی لغات کا مفہوم اردو میں واضح کیا ہے اس کا پہلا شعر یہ ہے۔

قادر اللہ اور یزدان ہے خدا
ہے نبی مرسل پیمبر رہنما

یہ سچ ہے کہ غالبؔ مسلمانوں میں پیدا ہوئے تھے مگر مذہب کی قبا ان کے جسم پر کبھی موزون نہ ہو سکی تشکیک کا جذبہ رہ

رہ کران کی زندگی کی گہرائیوں سے ابھرتا رہا۔

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے بہلانے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے

غالبؔ کی شاعری اوران کے خطوط میں خدا سے تمسخر اور استخفاف عقائد کا جو رنگ جھلکتا ہے۔ وہ اسی ذہنیت کا نتیجہ یا ثمرہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے سرمہدی کو یہ مشورہ دیا تھا کہ ''اگر آدمی بننا چاہے تو منطق اور فلسفہ پڑھ۔ قرآن اور فقہ پڑھ کر کیا کرے گا''۔ ۱۸۶۶ء سے مرزا کی طبیعت خراب رہنے لگی۔ وفات سے ایک دن پہلے دماغ پر فالج گرا اور اسی بے ہوشی کی حالت میں ۱۵ر فروری ۱۸۶۹ء کو ان کا انتقال ہوا۔

مومن خان مومنؔ

نام مومن خان اور تخلص مومنؔ تھا۔ ۱۸۰۰ء میں محلّہ کوچہ چیلان دہلی میں پیدا ہوئے مومنؔ کے آباواجداد کشمیر سے دہلی آئے۔ طبِ انکا خاندانی پیشہ تھا۔ ان کے والد کا نام حکیم غلام نبی خان تھا۔ جو اپنے زمانے کے مشہور طبیب تھے۔ مومنؔ ۲۶ برس کے تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہوگیا۔ مومنؔ کی زندگی پر ان کی ذات اور شخصیت پر گہرا اثر تھا۔ تعلیم کا آغاز گھر پر ہوا جب کچھ بڑے ہوئے تو شاہ عبدالعزیز کے مدرسے میں داخل ہوئے اور یہیں عربی کی تعلیم حاصل کی۔ انہوں نے اپنے زمانے کے مشہور عالم دین عبداللہ خان علوی سے فارسی کی تعلیم حاصل کی تھی۔ فن موسیقی میں مہارت کی وجہ سے مومنؔ مشاعروں میں ترنم سے غزل پڑھتے تھے۔ علم ریاضی میں وہ خواجہ نصیر کے علاوہ کسی کو اپنا ہم پلّہ نہیں سمجھتے تھے۔ مومنؔ نہایت نازک مزاج اور خوددار انسان تھے۔ ۵۲ برس کی عمر میں ۱۸۵۲ء میں انتقال ہوا۔ شاعر مومنؔ نے شاہ نصیر سے تلمذ اختیار کیا تھا۔

مومنؔ کی تصانیف میں ''کلیات مومن اردو'' (اس میں غزلیں، قصائد، مثنویاں، قطعات اور رباعیاں شامل ہیں) دیوان فارسی (جو غزلوں، قصائد، مثنویوں اور رباعیات پر مشتمل ہیں۔ مومنؔ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں اس صنف کو انہوں نے بڑی خوش اسلوبی سے برتا ہے۔ مومنؔ کے اشعار کی بلندی اور خوبی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ان کے ایک شعر ؎

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

مومنؔ کی شاعری کا بنیادی موضوع حُسن وعشق ہے۔مومنؔ کی غزلیں صنف غزل کے مزاج سے بہت قریب ہیں۔ان میں روایت کا رچاؤ ہے۔علامتوں اوراشاروں کی نیرنگی ہے۔رمزوایما کی فسوں کاری ہے۔زبان کی سادگی اور بیان کی رنگینی ہے۔نازک خیالی اورمعنی آفرینی،لب ولہجہ کا بانکپن اورآہنگ کی پُرکیف نغمگی نے مل کرایک ایک حسین اورلطیف امتزاج پیدا کیا ہے۔کہ یہ غزلیں شاہ کاربن گئی ہیں۔

وہ جوہم میں تم میں قرارتھا، تمھیں یادہوکہ نہ یادہو
وہی یعنی وعدہ نباہ کا، تمھیں یادہوکہ نہ یا دہو

ہجر پردہ نشیں میں مرتے ہیں
زندگی پردہ در نہ ہو جائے

حالِ دل یار کو لکھوں کیوں کر
ہاتھ دل سے جدا نہیں ہوتا

مومنؔ نے غزل کی روایت کوایک نئے رنگ وآہنگ سے آشنا کیا۔اوراس نے ایک نئی زندگی پیدا کی۔

جگرؔ مرادآبادی

نام علی سکندراوروطن مرادآباد تھا۔ ۱۸۹۰ء میں پیدا ہوئے۔جگرؔ نہایت شگفتہ اوررنگیں مزاج آدمی تھے۔انھیں معاشقہ کا بھی طویل تجربہ حاصل تھا۔شاعری انھیں ترکہ میں ملی تھی۔چودہ برس کی عمر سے شعرکہنا شروع کیا تھا۔ابتداء میں اپنے والد سے اصلاح لیا کرتے تھے۔ان کے بعد داغؔ کوکلام دکھانے لگے۔جگرؔ کی قدیم شاعری پرسب سے زیادہ اثر داغؔ کا نظرآتا ہے۔ جگرؔ کی شاعری میں کیف، وارفتگی اور بےخودی قریب قریب ہرجگہ ہے۔جوکلام میں امتیازی شان اورشاعر کے انہماک ذوق وجوش فکر کا پتہ دیتی ہے۔ان کی آنکھیں حسن کی اداشناس ہیں اوران کا دل لذتِ عشق کا سرمایہ دار ہے۔جس کے اثر سے کلام میں رنگینی اوردل کشی کا ایسا اضافہ ہوجاتا ہے جس سے پڑھنے والے پرایک خاص محویت طاری ہوجاتی ہے۔ جگر کے کلام کی ایک نمایاں خصوصیت سادگی اورروانی ہے۔وہ ثقیل الفاظ کبھی استعمال نہیں کرتے۔جوفارسی ترکیبیں کام میں لاتے ہیں وہ عموماً مناسب اوردل نشین ہوتی ہیں۔جس سے روانی اورلطف میں اضافہ ہوجاتا ہے۔محاورات کے برمحل استعمال سے کلام میں برجستگی اورایک خاص مزہ پیدا کرنے میں جگرؔ کوایک اچھا سلیقہ

حاصل ہے۔

جگر کی شاعری ایک زندہ و بیدار دل کی آتش فشانیوں سے بھری پڑی ہے۔ان کے کلام میں جوش بیان، جدّت ادا، حُسن خیال، شدّت احساس، تخلیل اور سوز واثر کے علاوہ ایک ایسی دلآویز اور مسحور کن نغمگی اور غنائیت موجود ہے۔ جوانہیں دوسروں سے ممتاز بناتی ہے۔ان کے غزلوں کے ترنم کی اساس اُس والہانہ پن پر ہے۔جس کی تعمیر عشق اور رومان کے ملے جلے جذبات سے ہوتی ہے۔انہوں نے اپنی غزلوں میں الفاظ صوت، ردیف اور قافیے کی جھنکار، شعری فضا اور خیال کی تابنا کی کے ساتھ ساتھ زمانے کے راگ ورنگ اور چلن سے جو نغمگی اور ترنم پیدا کیا ہے۔وہ مجموعی طور پر کانوں سے سُننے کا نغمہ نہیں ہے۔ بلکہ محسوسات کے ساتھ دل میں اتر جانے والا نغمہ ہے۔ جگؔر کی شاعری اور شخصیت کی اُن کی حیات ہی میں کافی قدر ہوئی۔مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے انہیں ڈاکٹر کی اعزازی ڈگری سے نوازا۔ساہتیہ اکاڈمی نے ان کے کلام پر پانچ ہزار روپئے کا انعام عطا کیا۔ جگؔر کا انتقال ۱۹۶۵ء میں ہوا۔جگؔر کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

ہم کو مٹا سکے یہ زمانے میں دم نہیں
ہم سے زمانہ خود ہے زمانے سے ہم نہیں
آئے تھے دل کی پیاس بجھانے کے واسطے
اک آگ سی وہ اور لگا کر چلے گئے

حسرت موہانی

سید فضل الحسن نام اور حسرتؔ تخلص تھا لیکن بہت کم لوگ ان کے نام سے واقف ہیں۔چنانچہ ایک جگہ خود فرماتے ہیں۔

جب سے کہا عشق نے حسرتؔ مجھے
کوئی بھی کہتا نہیں فضل الحسن

ان کا وطن موہان (ضلع) تھا لہٰذا حسرت موہانی مشہور ہوگئے۔ان کی پیدائش موہان میں 1881ء میں ہوئی اور ابتدائی تعلیم گھر پر۔اعلیٰ تعلیم کے لئے علی گڑھ آئے اور بی۔اے۔کیا شعروادب کے ساتھ ساتھ حسرت کو سیاست سے بھی کافی دلچسپی رہی اور اُنھوں نے علی گڑھ کی سیاست میں حصّہ بھی لیا۔یونیورسٹی کے انتظامیہ کی ناخوشی نے حسرت پر بارعتاب نازل کیا۔حسرت نے تسلیم کو اپنا اُستاد بنایا۔تسلیم کے اُستاد نسیمؔ اور نسیمؔ مومنؔ کے شاگرد تھے۔حسرتؔ نے

سلسلہ پر ہمیشہ ناز کیا ہے یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

حسرتؔ تری شُگفتہ کلامی پر آفرین
یاد آ گئیں نسیمؔ کی رنگین بیانیاں

حسرتؔ یہ وہ غزل ہے جسے سن کے سب کہے
مومنؔ سے اپنے رنگ کو تونے ملا دیا

حسرتؔ شاعروادیب اور سیاستدان ہیں بے با کی اورصاف گوئی اُن کے مزاج کا حصّہ ہے۔شاید اس لئے کسی سیاسی پارٹی نے اُنھیں برداشت نہیں کیا۔لیکن اُنھوں نے اپنا راستہ نہیں چھوڑا۔علی گڑھ کے اس مردِ مجاہد نے مکمل آزادی کی قراداد پیش کرنے کی جرأت کی تھی۔حسرتؔ جنگِ آزادی کے نڈر سپاہی تھے اوران کی کھری باتیں اپنی حکومت کو بھی ناگوار گذرتی تھیں۔حسرتؔ نے نظمیں لکھیں لیکن بنیادی طور پر وہ غزل گو تھے۔اُس زمانہ میں حالؔی اور دیگر لوگوں کے غزل پر سخت اعتراضات کے باوجود حسرتؔ کی نظر اس صنف سخن پر ٹھہری۔حسرتؔ کی شاعری میں اساتذہ کا رنگ نظر آتا ہے۔مگر اُن کی اپنی آواز ہے وہ حُسن کے پرستار اور عاشق مزاج ہیں اور اُن کا عشق خالص عشق مجازی ہے۔اُن کی شاعری کا سب سے جاندار پہلو عشق ہے اُن کی حُسن پرستی کی حد کوئی حسین وجمیل چہرہ نہیں ہے بلکہ اُنہوں نے خوبصورت الفاظ، دلکش تراکیب اور مترنم بحروں کو بھی ایک عاشق کی نظر سے دیکھا ہے۔حسرت موہانؔی کا انتقال ۱۲؍ مئی ۱۹۵۱ء کو ہوا۔

مثنوی

مثنوی کی تعریف: مثنوی کا مادّہ ثنیٰ یا ثنا ہے اور عربی میں ثنا ان چار دانتوں کو کہتے ہیں جو دو اوپر اور دو نیچے الگ الگ دوسرے دانتوں کی بہ نسبت بڑے ہوتے ہیں۔اس لحاظ سے مثنوی کے ہر شعر کے قافیے الگ الگ ہوتے ہیں۔ اس صنف شاعری کو مثنوی کا نام دیا گیا۔اس طرح مثنوی کا ہر شعر ہم قافیہ اور ہم ردیف ہوتا ہے۔مثنوی وہ صنف ہے جس میں داخلیت اور ہار جیت کی دوری مٹ جاتی ہے۔داستانی عنصر کی وجہ سے واقعہ کا بیان اور عشق کی وجہ سے جذبے کا اظہار مثنوی کی صنف میں اہم اجزاء قرار دیئے جاسکتے ہیں۔اسی کی بنا پر اس کی مختصر ترین تعریف یوں کی جاسکتی ہے کہ مثنوی ایک طرح کی منظوم داستان ہوتی ہے۔وہ داستان جو عشق کے جذبے پر مبنی ہو۔

مثنوی اردو شاعری کی چار بڑی مقبول اصناف میں سے ایک ہے۔مثنوی ایک طویل نظم ہوتی ہے۔جس میں کئی ہزار اشعار تک ہو سکتے ہیں۔مثنوی میں عام طور پر کوئی داستاں یا قصہ بیان کیا جاتا ہے۔اردو کی پرانی شاعری میں داستان ہی کی طرح مثنوی کو بڑی مقبولیت حاصل تھی۔مثنوی وہ صنف ہے۔جس میں داخلیت اور خارجیت کی دوئی مٹ جاتی ہے۔داستانی عنصر کی وجہہ سے واقعہ کا بیان اور عشق کی وجہ سے جذبے کا اظہار مثنوی کی صنف میں اہم اجزاء اقرار دیئے جاسکتے ہیں۔اسی کی بناء پر اس کی مختصر ترین تعریف یوں کی جاسکتی ہے کہ مثنوی ایک طرح کی منظوم داستان ہوتی ہے۔وہ داستان جو عشق کے جذبے پر مبنی ہو۔

ب۔مثنوی کے موضوعات:

چونکہ مثنوی ایک طویل قصّہ ہوتا ہے اور ایک خاص زمانے سے متعلق ہوتا ہے۔اس لئے علاوہ مناظر کے مقامات کا بیان،افراد قصّہ کے حالات و کردار اسی مقام کے رسم و رواج۔عوام و خواص کی زبان،لباس،طرز رہائش،معاشرت،پیشے سبھی کا بیان تفصیل سے ہوتا ہے۔ان سب کو بیان کرنے کے لئے زبان و بیان پر بڑی قدرت کی ضرورت ہوتی ہے۔اس لئے مثنوی کی بڑی کامیابی یہ ہے کہ ہر بیان حقیقت سے قریب فطری اور قدرتی ہو مبالغہ اور لفظی صناعی مثنوی میں اگر کثرت سے ہوگی تو اس کے حسن میں فرق آجائے گا۔سب سے اہم چیز واقعہ نگاری اور تاثیر ہے۔اگر مثنوی کو مختلف اور متنوع خارجی موضوعات کے لئے برتا جائے یا عشقیہ داستان کے بیان میں محض واقعات کے بیان کو تمام تر اہمیت تفویض کر دی جائے تو اس سے مثنوی کا اصل مزاج مجروح ہوتا ہے۔کیونکہ کسی صنف کے وجود کا راز محض اسی بات میں ہے کہ وہ انسانی شخصیت کے کسی خاص پہلو کو دوسری اصناف کی بہ نسبت بہتر طریقے سے سامنے لاسکتی ہے۔

قدیم دور کی مثنوی میں ایک طرف مذہبی مسائل پند و نصائح،وعظ و موعظت،رموز تصوّف وغیرہ نظر آئیں گے۔تو دوسری طرف حُسن و عشق کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کرتی ہوئی مثنویاں ملیں گی۔مثنوی میں موضوع کی بھی کوئی پابندی یا قید نہیں ہے۔معمولی سی معمولی چیز اُس کا موضوع بن سکتی ہے۔مرزا سوداؔ کی لاٹھی ہو یا میرؔ کا گھر حامد اللہ افسر کے گھر کا صحن کا نیم ہو یا دیا شنکر نسیمؔ کی شہزادہ تاج الملک اور بکاؤلی کی داستان عشق یا میر تقی میرؔ کے شکار نامے۔مثنوی کے مضامین میں بڑی وسعت اور ہمہ گیری ہے پھر بھی مثنویاں زیادہ تر ان مضامین سے وابستہ ملتی ہیں۔

مذہبی: مذہب ہمارا اُوڑھنا بچھونا ہے ہم اُسی کی اشارے پر چلتے ہیں۔انھیں نماز کی فضیلت اور اُس کے اُصول سکھانا۔

مذہبی درویشوں اور بزرگانِ دین کے پند ونصائح بتانا۔

اخلاقی: اخلاقیات کا رشتہ اگر چہ مذہب سے ہے لیکن اُردو میں ایسی مثنویاں ملتی ہیں جو بین الاقوامی اخلاقیات سے تعلق رکھتی ہیں۔ جھوٹ بولنا اوران پڑھ رہنا ہر قوم اور ہر مذہب میں بُرا ہے۔

عشقیہ: مثنویوں کا بہت بڑا حصہ عشقیہ داستانوں پر مشتمل رہا ہے۔ مرزا شوق کی زہر عشق۔ میر حسن کی سحر البیان۔ میر کی شعلۂ عشق۔ دیا شنکر نسیم کی گلزار نسیم وغیرہ۔

رزمیہ: اردو میں مرثیوں میں شہدائے کربلا کے بے مثال شجاعانہ کاموں کی ستائش ملتی ہے۔ جنگ کے منظر فوجوں کی آمد ورفت اِدھر اُدھر کوچ کرنا۔ شمشیر زنی اور تیر زنی اور نیزہ بازی کے بڑے خوشنما خاکے پیش کئے گئے ہیں۔

ہجویہ: شاعر ایسے لوگوں کی ہجو کرنے پر آمدہ ہو جاتا ہے جو صحیح معنوں میں نااہل ہیں۔ میر کی کئی ہجویہ مثنویاں خصوصاً ہجو آکول۔ ہلاس رائے۔ انشا کی در ہجو گیاں چند سا ہو کار وغیرہ۔

واقعاتی: جس میں شاعر اپنے ذاتی حالات اور واردات یا گرد وپیش کے واقعہ کا تذکرہ کرتا ہے۔ اس ضمن میں میر کی مثنویوں کو بڑی فوقیت حاصل ہے۔ خصوصاً وہ مثنویاں جو شکار ناموں کے عنوان سے انھوں نے نواب آصف الدولہ کے شکار نامے لکھے ہیں۔ صحرائی فضا، جانوروں کی کلیلیں، درختوں کا جھرمٹ، پھولوں کی بہار، نواب بہادر موصوف کے خیموں اور ملازمین وغیرہ کے نہ صرف خوبصورت بلکہ حقیقی بیانات دیئے ہیں۔ ہمارے یہاں کے موسموں میں برسات کا موسم سچ پوچھئے تو بہار کا موسم ہے۔ مولانا حالی کی برکھا رُت، مرزا سودا کی در شکایت موسمِ گرما اور زمستان، بارانِ رحمت کبھی کبھی زحمت بن جاتی ہے۔ اگر اس زحمت کی سچّی اور بھرپور تصویریں دیکھنا ہو تو میر کی مثنوی در مذمت پر شگال ہے۔

ابر رحمت ہے یا کہ زحمت ہے ایک عالم غریقِ رحمت ہے
بوند تھمتی نہیں ہے اب کے سال چرخ گویا ہے آب در و بال
جیسے دریا اُبلتے دیکھے ہیں یاں سو پرنالے چلتے دیکھے ہیں

وطنی اور قومی: اس قسم کی بے شمار نظمیں ہیں مگر ان کی ہئیت مثنوی کی نہیں ہے۔ اس قسم کی مثنویاں لکھنے کا خیال اُس وقت سے پیدا ہوا جب ہندوستانیوں میں ہوم رول اور حصولِ آزادی کے جذبات بیدار ہوئے اور فرقہ وارانہ فسادات ہونے لگے۔ مولانا حالی کی مثنوی ''حُبِ وطن'' ہے۔ اس مثنوی میں مولانا حالی نے اپنے وطن اور اہل وعیال کی یاد میں کڑھنے ہی

کو وطن کی محبت نہیں ٹھہرایا بلکہ حُبِ وطن سے ان کا منشا یہ ہے۔

قوم سے بڑھ کے جان تک عزیز نہ ہو　　قوم سے بڑھ کے کوئی چیز نہ ہو
مرد ہو تو کسی کے کام آؤ　　ورنہ کھاؤ پیو اور چلے جاؤ

مثنوی کی ہئیت اور ساخت یا مثنوی کا فن:

مثنوی کی تعمیری تشکیل میں اس کے مخصوص موضوع اور مزاج کے علاوہ اس کی مخصوص ہئیت کو بھی مساوی اہمیت حاصل ہے۔مثنوی کے لغوی معنی ہیں۔''دو دو'' یا ''دو جزو والی چیز''یعنی اسی کا مفہوم ہے۔''دوہرا کرنا''اس سے واضح ہوتا ہے کہ ظاہری ہئیت کے لحاظ سے مثنوی ایک ایسی شعری تخلیق ہے جس کے ہر شعر کے دونوں مصرعے ہم وزن اور ہم قافیہ ہوں۔یعنی ہر شعر کا قافیہ پچھلے شعر کے قافیے سے مختلف ہو مثلاً دیا شنکر نسیم کی مثنوی ''گلزار نسیم'' سے چند شعر ملاحظہ ہوں

پوچھا پریوں سے کچھ خبر ہے　　شہزادی بکاولی کدھر ہے
منہ پھیر کے ایک مسکرائی　　آنکھ ایک نے ایک کو دکھائی
چتون کو ملا کے رہ گئی ایک　　ہونٹوں کو ہلا کے رہ گئی ایک

مثنوی میں ردیف کا استعمال نسبتاً کم ہوتا ہے ایک اندازے کے مطابق ہر مثنوی میں دس فی صد ہی اشعار مردف ہوتے ہیں اور باقی غیر مردف۔اوپر دی ہوئی مثال میں تین میں سے دو اشعار مردّف ہیں اور ایک غیر مردّف پہلے شعر میں ''ہے'' ردیف ہے۔قافیے ''خبر اور کدھر'' ہیں۔تیسرے شعر میں ردیف ''کے رہ گئی ایک'' ہے اور قافیے ''ملا'' ''ہلا ہیں'' اور دوسرا شعر غیر مردف ہے۔مثنوی کا ایک اہم جز واقعہ نگاری ہے جب شاعر کو اپنے کرداروں کی حیثیت اور ان کے آپس کے تعلقات کو نمایاں طور پر واضح کرنا ہوتا ہے۔تو یہیں پر شاعر کو موقع ملتا ہے۔جہاں وہ انشاء پردازی کے جوہر دکھاتا ہے۔حالؔی نے مثنوی کے لئے جن چند چیزوں کو لازمی قرار دیا ہے۔وہ یہ ہیں۔

1. ربط کلام کا خیال رکھنا خصوصاً اس وقت جب کے مثنوی میں کوئی قصہ مذکور ہو۔
2. جو قصّہ مثنوی میں بیان کیا جائے۔اس کی بنیاد ما فوق العادت اور غیر ممکن باتوں پر نہ رکھی جائے۔
3. مبالغہ کو اہل بلاغت نے صنائع معنوی میں شمار کرلیا ہے۔مگر اس قدر نہ ہو کہ کلام کو بے قدر و سبک بنا دے۔
4. مقتضائے حال کے موافق کلام کا پیش کرنا خصوصاً جب کوئی قصّہ بیان کرنا مقصود ہو۔

5. جو حالت بیان کی جائے وہ لفظاً اور معناً عادت کے موافق ہو۔

6. قصّہ میں اس بات کا لحاظ رکھنا کہ ایک بیان دوسرے بیان کی تکذیب نہ کرے۔

7. اہم واقعات جن پر قصّہ کی بنیاد رکھی گئی ہے نہایت صراحت سے بیان کرنا۔ اسی طرح ضمنی باتوں کو رمز و کنایہ میں ادا کرے۔

میر حسؔن

اردو شاعری کے عہد زرین کے ایک اہم شاعر میر حسؔن جن کا پورا نام غلام حسن تھا، دلی میں پیدا ہوئے اور تعلیم و تربیت بھی وہیں پر ہوئی۔ ان کے والد کا نام میر غلام حسن تھا۔ انہوں نے اپنی ساری زندگی غربت میں گذاری۔ زندگی میں کئی عشق بھی کئے۔ ان کے ہاں تصوف اور رومانیت ملتی ہے۔ میر حسؔن کی اردو شاعری کا آغاز فیض آباد میں ہوا۔ انہوں نے غزلیں کہیں، قصیدے لکھے میر حسن کو زندہ جاوید نہ تو غزل نے کیا اور نہ ہی قصیدے نے۔ بلکہ مثنوی میر حسؔن کی حیات جاودانی کی باعث ہے۔ مثنوی ''سحر البیاں'' جیسا شاہکار میر حسؔن کی جدتِ طبع کا نتیجہ ہے۔ یہ مثنوی ۱۷۸۵ء میں آصف الدولہ کے عہد میں تصنیف ہوئی۔ اس مثنوی کی وجہ سے میر حسؔن کو اردو شاعری میں بہت اہم اور عظیم مرتبہ ملا ہے۔ یوں تو میر حسؔن نے کُل بارہ مثنویاں لکھی ہیں۔ لیکن ''سحر البیان'' اردو شاعری میں اپنا جواب نہیں رکھتی۔ یہ صرف میر حسؔن کا ہی نہیں بلکہ اردو کا زندہ جاوید شاہکار ہے۔

''سحر البیان'' اپنے بیان کی صفائی اور سلاست کے ساتھ وہ تمام شاعرانہ خوبیاں جیسے منظر نگاری، کردار نگاری جذبات نگاری، تسلسل بیاں، بیان کی چستی، طرز اظہار کی رعنائی روزمرہ اور محاورے کی خوبی شامل ہیں۔ ''سحر البیان'' میر حسؔن کی آخری عمر کی تخلیق اور ایک ایسا فن پارہ ہے جو اس سے پہلے نہ اس طور پر لکھا گیا اور نہ اس کے بعد اس طور پر کوئی مثنوی لکھی گئی۔

جو مصنف سنیں گے کہیں گے سبھی — نہ ایسی ہوئی ہے نہ ہوگی کبھی
نہیں مثنوی ہے یہ ایک پھلجھڑی — مسلسل ہے موتی کی گویا لڑی
نئی طرز ہے اور نئی ہے زباں — نہیں مثنوی ہے یہ ''سحر البیان''
رہے گا جہاں میں میرا اس سے نام — کہ ہے یادگارِ جہاں یہ کلام

دنیا اور زمانہ بہت بدل گیا ہے، سوچنے کے انداز اور عشق کے تصور میں بھی تبدیلی آ گئی ہے لیکن میر حسنؔ کی مثنوی ''سحر البیان'' جس میں شہزادے بے نظیر اور شہزادی بدر منیر کی عشق کی داستان بیاں کی گئی ہے۔ آج بھی دلچسپی کے ساتھ پڑھی جاتی ہے۔ اس مثنوی میں ۲۱۷۹ اشعار ہیں اور اس میں وہ تمام خصوصیات یکجا ہوگئی ہیں جو ایک مثنوی میں تصور کی جاسکتی ہیں۔

میر حسنؔ کی مثنوی میں داستان بھی ہے اور ترتیب ورنگ قوتِ تخیل، شاعرانہ صفات، توازن اور اختصار، تہذیب ومعاشرت، منظر کشی وکردار نگاری، سلاست وروانی، زبان وبیان بھی شامل ہیں۔ داستان کے اعتبار سے مثنوی میں بادشاہ، وزیر، شہزادے اور شہزادیاں، محلات، عیش وعشرت کے مناظر، خوبصورت باغ، دلکش نظارے وغیرہ شامل ہیں۔ میرؔ حسن نے ''سحر البیان'' میں اپنے دور کی زندگی اور تہذیب کی ایسی زندہ اور جیتی جاگتی تصویریں پیش کی ہیں کہ یہ مثنوی اس دور کی زندگی اور تہذیب کی بہترین ترجمان بن گئی ہے۔ میرؔ حسن کی مثنوی اس تہذیب کی روح، اس زمانے کے ماحول اور سماج کی حقیقی ترجمان ہے۔ مثلاً قدیم زمانے کا لباس، شادی بیاہ کی رسمیں، زیور، لوگوں کے رہنے سہنے کا طریقہ وغیرہ وغیرہ۔ اس زمانے کے رسم ورواج میں برس گانٹھ، چھٹی، دودھ چڑھانے کی رسم کو ہندوستانی معاشرہ میں ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ میر حسنؔ نے ان رسوم کو اپنی مثنوی ''سحر البیان'' میں خاص اہتمام کے ساتھ پیش کیا ہے۔

برس گانٹھ جس سال اس کی ہوئی — دلِ بستگان کی کمر کھل گئی
وہ گل جب کہ چوتھے برس میں لگا — بڑھایا گیا دودھ اس ماہ کا
لگا پھرنے وہ سرو جب پاؤں پاؤں — کئے بردے آزاد تب اس کے ناؤں

میر حسنؔ نے اپنی مثنوی میں وہی زبان استعمال کی ہے جو اس وقت کی عام بول چال کی زبان تھی۔ وہ موقع ومحل کے مطابق زبان استعمال کرتے ہیں۔ ہر طبقہ اور کردار کی زبان میں اس طبقہ کا مخصوص لہجہ اور مزاج بھی موجود رہتا ہے۔ اس کے علاوہ طرزِ بیاں کی وجہ سے ان کے کئی اشعار ضرب المثل بن گئے ہیں۔

برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن — جوانی کی راتیں مرادوں کے دن
سدا عیش دوراں دکھاتا نہیں — گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں
کسی پاس دولت یہ رہتی نہیں — سدا ناؤ کاغذ کی بہتی نہیں

مثنوی ''سحرالبیان'' کی خوبیاں قابل ذکر ہیں:

۱۔زبان فطری سلاست رکھتی ہے۔

۲۔جوقصّہ منظوم کیا گیا ہےاس کے اجزاءتناسب کےلحاظ سےخوب ہیں۔

۳۔تشبیہات واستعارات فطری انداز میں ہیں۔

۴۔مبالغے اناپ شناپ نہیں ہیں۔

۵۔رسم ورواج،سچائی اورصداقت کےساتھ حوالہ قلم ہوئے ہیں۔

۶۔جہاں معاملۂ خارجی بیان ہوا ہےتصویر کاحکم رکھتا ہے۔

۷۔تمام امورذہنیہ اورواردات قلبیہ پیرایہ شاعری میں بڑی راستی اورپُرتاثیری کےساتھ رقم ہوئے ہیں۔

۸۔ہرجُزوقصہ کچھ نہ کچھ اخلاقی یاتمدنی نتیجہ پیدا کرتا ہے۔

۹۔تمام امورذہنیہ اورمعاملات خارجیہ کے بیانات فطری اسلوب رکھتے ہیں۔

مجموعی طور پرمیرؔحسن کی مثنوی اردو کاایک عظیم شعری شاہکار کہا جاسکتا ہے جواپنے موادِزبان اورفنی چابکدستی کی وجہ سےاردوادب میں ایک اونچے مقام کا حامل ہے۔

میرحسنؔ کی مثنوی میں روزمرہ اورمحاوروں کی صفائی۔قافیوں کی نشست ،مصرعوں کی برجستگی اورربط کلام کو خوشنمائی کےساتھ اس طرح برقرار رکھا گیا ہے کہ سادگی اورصفائی کے باوجودتاثیراوردلگدازی باقی رہتی ہے۔میرحسن کے ہاں روزمرّہ کلام اپنی فطری انداز میں پیش ہوا ہےاوران کے اکثر اشعاراسی سلاست اورفصاحت کی وجہ سےضرب الامثال میں تبدیل ہوگئے ہیں۔

میرؔحسن کے یہاں الفاظ نرم وملائم، بیان شگفتہ اور محاورے دل کش اور پاکیزہ ہیں۔روز مرّہ تشبیہات،استعارات اورمحاورات کالطیف امتزاج سحرالبیان میں کثرت سے ملتا ہے۔اس وجہ سے میرؔحسن کی مثنوی میں بے پناہ روانی آگئی ہے۔میرؔحسن کی یہ مثنوی اس لئے بھی اردوادب کا ایک معجزہ کہلائی جاسکتی ہے کیوں کہ ان کے سامنےاس طرح کی مثنوی کا کوئی نمونہ موجودنہیں تھا۔یہ مثنوی ان کی اختراع بھی ہےاوراپج بھی۔محمدحسین آزادؔ نے میرؔحسن کی مثنوی کی خوبیوں کادل کھول کراعتراف کیا ہے۔ مولوی حبیب الرحمٰن خان شیروانی نے بھی ان کی مثنوی کی

خوب تعریف کی ہے۔ میرؔ حسن نے مثنوی کے کرداروں کو زیادہ تر ایسا ہی پیش کیا ہے جیسا کہ انہوں نے لکھنو کے معاشرے میں ان کو دیکھا تھا۔ داستانی کردار ہونے کے باوجود ان کا ضمیر خاکِ لکھنو سے ہی اٹھا ہے اور وہ بڑی حد تک ان کی سچی اور حقیقی تصویریں پیش کرنے میں کامیاب معلوم ہوتے ہیں۔ غرض اپنے اسلوب بیان اور اپنی فصاحت وبلاغت، اپنے فطری روزمرّہ سلاست وسادگی بیان کی وجہ سے مثنوی ''سحرالبیان'' اردو شاعری میں ایک بلند مرتبہ پر فائز ہے اس مثنوی کی کامیابی کا سہرا میر حسنؔ کے سر باندھا جاتا ہے۔

مرثیہ

مرثیہ کی تعریف مرثیہ وہ نظم ہے جس میں کسی شخص کے انتقال پر اظہار غم کے ساتھ اس کی خوبیاں بیان کی جاتی ہیں۔ عام طور پر مرثیہ اس نظم کو کہتے ہیں جس میں کربلا کے اندوہناک واقعات بیان کئے جاتے ہیں اور حضرت امام حسین اوران کے ساتھیوں کے شہید ہونے کا ماتم کیا جاتا ہے۔ ''مرثیہ'' عربی کا لفظ ہے جو ایک اور لفظ ''رثا'' سے مشتق ہے۔ ''رثا'' کے معنے ہیں ''مردے پر رونا اور آہ وزاری کرنا'' یہ صنف عربی شاعری میں رائج تھی۔ عزیزوں اور بزرگ وبرگزیدہ ہستیوں کی موت پر رنج والم کے جذبات سے لبریز جو اشعار کہے جاتے ہیں انہیں ''مرثیہ'' کہا جاتا ہے۔

مرثیہ کے موضوعات: مرثیے کی صنفی شناخت خاص طور پر موضوع پر مبنی ہے۔ یہ درست ہے کہ انیس اور دبیر کے مرثیوں کی بے پناہ مقبولیت کی وجہ سے بڑی حد تک مسدس کی ہئیت اس کی پہچان میں داخل ہوگئی، لیکن ابتدا میں اس کی کوئی مخصوص ہئیت نہیں تھی اور یہ صنف کے بجائے محض موضوع ہی پر اپنی شناخت کی اساس رکھتی تھی۔ مرثیے میں کسی ہئیت کی تخصیص کے نہ ہونے کے سبب یہ صنف اقسامِ شعر کی فہرست سے خارج رہی۔ موضوع کے لحاظ سے اردو مرثیوں کو دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں:

(۱) وہ مرثیے جو حضرت امام حسینؓ اور ان کے ساتھیوں کی شہادت اور کربلا کے دیگر واقعات پر مبنی ہیں۔

(۲) وہ مرثیے جو مختلف مشاہیر ملک وقوم یا اپنے اعزّہ کی اموات پر شاعروں نے لکھے۔

مرثیہ کے اجزائے ترکیبی:

مرثیہ میں اجزائے ترکیبی کا یہ سلسلہ میرؔ ضمیر نے قائم کیا۔ لیکن تمام مرثیوں میں ان تمام اجزاء کی موجودگی یا ترتیب لازماً نہیں پائی جاتی کیونکہ درج ذیل اجزائے ترکیبی کو قائم رکھنا اور ان کی ترتیب کو برقرار رکھنا کافی مشکل تھا۔

اوّل یہ کہ وہ مرثیہ طویل ہوجاتا ہے اور اپنا اثر کھو دیتا ہے۔ اور دوم یہ کہ مرثیہ گو اپنی تخلیقی قوت کا بھرپور اظہار نہ کر پاتے اس لئے مرثیے کی اصل تخلیقی قوت، جذبات نگاری، واقعات کی تصویر کشی اور رزم آرائی کے نہایت طاقت ور پُر تاثیر بیانات میں مضمر ہے۔

مرثیہ کے اجزائے ترکیبی حسبِ ذیل ہیں:

۱۔ چہرہ: یہ مرثیہ کا ابتدائی حصّہ ہے جس میں شاعر کو ہر قسم کے مضامین یا قصے کی آزادی ہے۔ چہرہ یعنی صبح کا منظر۔ رات کا سماں، دنیا کی بے ثباتی، باپ بیٹے کے تعلقات کی دشواریاں۔

۲۔ سراپا: اس میں ہیرو کے قد و قامت، خط و خال، لباس وغیرہ کا بیان ہوتا ہے۔

۳۔ گریز: یعنی مرثیے کی اصل قصے کی طرف واپسی۔

۴۔ رخصت: اس حصّے میں اہلِ خاندان سے جنگجو ہیرو کے رخصت کا بیان کیا جاتا ہے۔ حضرت امام حسینؓ کے خیمے سے جب کوئی بہادر میدان کی طرف کوچ کرتا ہے تو سب اہل خیمہ اسے بہ حسرت و یاس لیکن تر و تازہ قوت ایمانی کے ساتھ رخصت کرتے ہیں

۵۔ آمد: یعنی میدانِ جنگ میں ہیرو کی آمد کا بیان

۶۔ رجز: عرب میں رواج تھا کہ میدان جنگ میں حریفین ایک دوسرے کے سامنے للکارتے ہوئے آمادہ ہوتے ہیں۔ اس فخریہ اظہار کو اصطلاحاً ''رجز'' کہا جاتا ہے۔ مرثیہ گویوں نے اپنے اکثر مرثیوں میں اس موقع کی نہایت موثر اور جوشیلی تصویریں پیش کی ہیں۔

۷۔ رزمیہ: مرثیے کا یہ خاص الخاص حصہّ ہوتا ہے۔ یعنی جنگ کی تفصیلات مثلاً جنگ کی عمومی ہنگامہ آرائی فوجوں کی تیاری اور سامان حرب، سپاہ کی جنگ کے لئے آمادگی اور بے چینی اصل معرکہ آرائی کی تصویر کشی اور فنونِ جنگ کا ذکر، گھوڑے کی تعریف، تلوار کی مختلف صفات کے نہایت پُر قوت بیانات شامل ہیں۔

۸۔ شہادت: حضرت امام حُسینؓ اور ان کے اہل کنبہ میدانِ جنگ میں بے مثال بہادری کے ساتھ حریفوں کے نرغے میں گھرے ہوئے معرکہ آرائی کرتے کرتے مجروح ہوکر گر جانے سے لے کر دم نکلنے تک کا عرصہ، مرثیہ میں شہادت کا حصّہ ہوتا ہے۔

۹۔ ماتم و بین: یہ مرثیہ کا آخری حصّہ ہوتا ہے اور رنج والم کی عکّاسی کے لحاظ سے نہایت پُر اثر ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس خاکے میں ہر مرثیہ نگار اپنے طور پر رنگ بھرتا ہے اور نئے نئے مضامین اور نت نئے گوشے پیدا کرتا ہے۔

مرثیہ کی تاریخ:

وقت اور زمانے کے ساتھ ساتھ جوں جوں صنفِ مرثیہ کا ارتقاء ہوا اس کی تشکیلی ہئیتیں بھی بدلتی رہیں۔ ابتدا میں مرثیے ''دوبیتی'' کی ہئیت میں لکھے گئے۔ جس کی تشکیلی صورت یہ ہوتی تھی کہ تین مصرعہ بند کہلاتے تھے اور چوتھا ٹیپ کا مصرعہ۔ ابتدائی زمانے کے مرثیے اور بھی کچھ ہئیتوں مثلاً غزل، مثنوی اور ترکیب بند میں موجود ہیں۔ سوداؔ نے مخمس کی ہئیت میں ترکیب بند اور ترجیع بند مرثیوں کے علاوہ مسدس، منفرد، دوازدہ بند اور مستزاد کی ہئیتوں میں بھی مرثیے لکھے ہیں۔ غالبؔ نے ''مرثیۂ عارف'' غزل کی ہئیت میں، حالیؔ نے ''مرثیۂ غالب'' ترکیب بند میں اور اقبالؔ نے اپنی والدہ کا مرثیہ مثنوی کی ہئیتوں میں لکھ کر مسدسی ہئیت سے گریز کیا ہے۔ یہ ساری مثالیں اس بات کی شاہد ہیں کہ مرثیہ کسی مخصوص ہئیت کی بنا پر نہیں بلکہ اپنے محدود مخصوص لیکن نہایت موثر اور پُر قوت موضوع کی بنا پر صنفی شناخت رکھتا ہے۔

شروع میں مرثیہ مختصر ہوتا تھا۔ کوئی خاص شکل بھی معین نہ تھی۔ کبھی کبھی مربع کی شکل میں رہا۔ کبھی غزل کی شکل میں۔ مضمون کے لحاظ سے زیادہ تر مصائب کے واقعات پر مبنی ہوتا تھا۔ عموماً مذہبی نقطہ نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور ثواب کے لئے پڑھا جاتا۔ شمالی ہند میں میرؔ و سوداؔ کے مرثیے مشہور ہوئے اور اسی عہد میں اس کی شکل مسدس کی ہوگئی۔ جو رفتہ رفتہ اتنی مقبول ہوئی کہ مستقل طور پر مسدس مرثیوں کے لئے مخصوص ہوگیا۔

بعض مورخین کا خیال ہے کہ مرثیہ کو پہلی بار جس نے مسدس کی شکل دی وہ مرزا رفیع سوداؔ تھے۔ بعد میں مرثیہ کی یہی ہئیت سب سے زیادہ مقبول رہی۔ واقعاتِ کربلا کے علاوہ جو مرثیے لکھے گئے، انہیں ''شخصی مرثیے'' کہا جاتا ہے۔ اردو شاعری میں شخصی مرثیوں کا اچھا خاصا ذخیرہ موجود ہے۔ خاص طور پر حالیؔ کا مرثیۂ غالبؔ، چکبستؔ کا مرثیۂ تلکؔ اور اقبالؔ کا مرثیۂ داغؔ۔ شخصی مراثی کی اہم مثالیں ہیں۔ شخصی مرثیوں میں بھی مرنے والے کے اوصافِ حمیدہ کا ذکر ہوتا ہے۔ حالیؔ کے لکھے ہوئے مرثیۂ غالب کے چند اشعار درج ذیل ہیں:

بلبلِ ہند مرگیا ہیہات — جس کی تھی بات بات میں ایک بات
نکتہ داں نکتہ سنج نکتہ شناس — پاک دل پاک ذات پاک صفات

شیخ اور بذلہ سنج شوخ مزاج رند اور مرجعِ کرام وثقات

لیکن اردو مرثیوں میں اہم ذخیرہ واقعہ کربلا سے متعلق مرثیوں کا ہے۔ یہ مرثیے نیم مذہبی اور نیم تاریخی ہیں۔ مرثیے کی تدریس مرثیہ پڑھانے سے پہلے واقعہ کی تفصیل ذہن نشین کرادینا ضروری ہے اور اس واقعہ اور اس کے اہم کردار کا تعارف دل نشیں پیرائے میں کرادینا لازم ہے تاکہ طالب علم مطالعے کے دوران الجھن میں نہ پڑیں۔ مرثیہ پڑھاتے وقت نظم کا ایک دوسرا تصور سامنے آتا ہے جس میں اس واقعے کو مربوط اور مکمل طور پر بیان کیا جاتا ہے۔ مرثیہ میں کرداروں کے مکالمے اور ان کے حرکات وسکنات کا بیان کیا جاتا ہے۔ مگر شاعر بھی خود بہت کچھ بیان کرتا جاتا ہے ،اسی لحاظ سے مرثیہ نیم ڈرامائی ،نیم بیانیہ نظم کی مثال ہے۔ کسی واقعے کے بیان کرتے وقت مناسب فضا، واقعات کی صحیح ترتیب ،کرداروں کے مناسب تعارف اور ان کے باہمی تعلق کا خیال رکھنا ہوتا ہے ،میر انیس کے مرثیے اس کی واضح مثال ہیں۔ مرثیے کی فضا اور قصّہ طالب علموں کو سمجھانے کے بعد ہر مرثیے کی وحدتِ تاثر اور اس کی ترتیب کو ذہن نشین کرانا مناسب ہوگا۔ طالب علم کو مرثیے کی مجموعی وحدت کا احساس ہونا چاہئے۔ مرثیہ نگار اس مجموعی وحدت کو مختلف مناظر اور کیفیات کی تصویر کشی سے حاصل کرتا ہے مثلاً واقعہ شہادت کی المناکی کو اور زیادہ نمایاں کرنے کے لئے صبح کے منظر کی تصویر کشی ۔تین دن رات پیاسے رہنے والوں کے بیان سے پہلے صحرائے کربلا کا یہ بیان بعد میں آنے والے مناظر کی کیفیت کو کتنا المناک بنادیتا ہے۔

کھا کھا کر اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا
تھا موتیوں سے دامنِ صحرا بھرا ہوا

غرض مرثیہ پڑھتے اور پڑھاتے وقت مناظر کا یہ دروبست اور ربط بہت اہمیت رکھتا ہے اور مرثیئے کے مجموعی تاثر میں اضافہ کرتا ہے۔ مرثیہ پڑھاتے وقت استاد کا فرض ہے کہ کردار کی خصوصیات طلباء کے ذہن نشین کرادی جائیں۔ ہر کامیاب مرثیہ نگار کرداروں کے مکالمے ،ان کی آمد اور ان کی جنگ وجدل نظم کرتے وقت اس مخصوص کردار کے مزاج کا خیال رکھتا ہے اور اس سے مطابقت رکھنے والے الفاظ استعمال کرتا ہے مثلاً حضرت عباس جوان، شجاع اور رعب داب والے تھے۔ حسینی فوج کا علَم بھی انہیں کو سونپا گیا تھا۔ اسی لئے میدانِ جنگ میں ان کی آمد کا بیان بھی شان وشوکت کے الفاظ میں کیا گیا ہے۔

آیا وہ شیر خیمے سے باہر علَم لئے　　صحرا کو آئی فتح سپاہ حشم لئے
جرأت نے بڑھ کے بوسۂ تیغ دودم لئے　　نصرت نے چومے ہاتھ ظفر نے قدم لئے
خورشید کا جلال نگاہوں سے گر گیا　　اقبال سر کے گرد ہما بن کے پھر گیا

مولانا شبلی نے اسی نقطۂ نظر سے انیسؔ اور دبیرؔ کے مرثیوں کے بعض مکالموں کا موازنہ کیا ہے اور اسی بنا پر انیسؔ کے مرثیوں کو فصاحت کا اعلیٰ نمونہ قرار دیا ہے۔ایک مقام پر ایک انجان قاصد حضرت امام حسین سے ان کا نام پوچھنا چاہتا ہے، دبیرؔ نے اس موقعہ پر حضرت امام حسین کی زبانی یہ مصرعہ کہلوایا ہے۔

بولے کہ میں حسین علیہ السلام ہوں

لیکن انیسؔ نے اسی صورتِ حال میں حضرت امام حسینؓ کے مکالمے کو اس طرح بیان کیا ہے۔

یہ تو نہیں کہا شہ مشرقین ہوں
مولا نے سر جھکا کے کہا میں حُسین ہوں

آخری مکالمے میں عاجزی اور انکساری کے وہ سبھی اجزاء شامل ہیں جو حضرت امام حسینؓ کے کردار میں شامل تھے اور اسی کے ساتھ ساتھ سر جھکا کر نام بتانے کے عمل میں جو ڈرامائی تاثر پیدا ہو گیا ہے اس نے مصرعہ کو اور بھی زیادہ پُر اثر بنا دیا ہے۔مرثیہ کا اہم ترین مرحلہ یہ ہے کہ مرثیہ نگار کو اپنے سبھی ممدوحین کو بہادر، شجاع، برگزیدہ اور نیک بندے ظاہر کرنے کے بعد باطل کے ہاتھوں ان کی شکست بھی دکھانی ہوتی ہے اور یہی مرحلہ مرثیے کا سب سے نازک مرحلہ ہے ۔مرثیہ پڑھاتے وقت مرثیہ نگار کو اس حکمت عملی پر خاص طور پر توجہ دلانا چاہئے۔ یہ بیان جس قدر موثر اور دل دوز ہوگا مرثیہ اتنا ہی کامیاب اور پُر اثر ہوگا۔آخر میں مرثیے کے وحدت تاثر پر روشنی ڈالنے کے ساتھ ساتھ مرثیے کے مختلف حصّوں میں مختلف اندازِ بیان کا بھی موازنہ کرنا چاہئے تا کہ طالب علم کو اس بات کا اندازہ ہو جائے کہ شاعر نے چہرے میں جس طرح شفگتہ مضامین باندھے تھے وہ رخصت کا مضمون باندھتے وقت کس طرح گھریلو فضا میں ڈھل گئے۔اور رزمیہ کے بیان میں کس طرح ان میں روانی اور شوکت آ گئی اور بین میں کس طرح یہی اندازِ بیان روزمرّہ کی زبان میں ڈھل گیا۔

انیسؔ

میر ببر علی نام اور انیسؔ تخلص فرماتے تھے۔ انہوں نے صنفِ مرثیہ کو بام عروج پر پہنچانے کا اہم کارنامہ انجام دیا ہے۔ انیسؔ کے بعد کئی مرثیہ نگار پیدا ہوئے لیکن کوئی بھی اس صنف سخن میں اضافہ کرنے میں کامیاب نہیں ہوا۔

میر انیسؔ کے والد میر محمد مستحسن خلیق تھے۔ انیسؔ کا پیدائشی مقام فیض آباد تھا۔ لیکن بچپن ہی میں باپ کے ساتھ لکھنو آ گئے تھے۔ اس زمانے کے نامور علماء نے انہیں عربی و فارسی کی تعلیم دی۔ شاعری اور زبان دانی دونوں انیسؔ کو ورثے میں ملے تھے۔ اس لئے کم سنی میں شعر کہنا شروع کر دیا۔ عام رواج کے مطابق شعر گوئی کی شروعات غزل سے کی۔ لیکن والد صاحب نے جب عاقبت کی فکر کا احساس دلایا تو مرثیہ پر اپنی توجہ مرکوز کر دی۔ مختلف علوم، گھوڑ سواری اور سپہ گری سے واقفیت رکھتے تھے۔ اس لئے مرثیہ گوئی میں ان کی کامیابی بے مثال ہے۔

میر انیسؔ اردو کے اولین رباعی گو شعراء میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ ابتداء میں رباعی کو جن شعراء نے فکر و فن کے اعتبار سے معراجِ کمال تک پہنچایا ان میں دبیرؔ اور انیسؔ کے نام بڑے ہی احترام کے ساتھ لئے جاتے ہیں۔

رباعی کو اپنا پورا رنگ و آہنگ سب سے پہلے میر انیسؔ کے ہاتھوں ملا۔ میر انیسؔ نے سب سے پہلے رباعی کو مذہبی اور اخلاقی مضامین سے مالا مال کیا۔ میر انیسؔ کی رباعیوں کا ایک خاص وصف جذبات نگاری ہے۔ وہ انسانی جذبے کو خوب سمجھتے ہیں اور ان جذبات کو اشعار کے روپ میں ڈھال کر سراپا بخشتے ہیں۔ انیسؔ کا لہجہ نرم بھی ہے اور ترش بھی۔ وہ انسانوں کی نفسیات کو سمجھتے ہیں۔ اسی لئے اپنی رباعیوں میں نفسیاتی کیفیت کو ابھارنے کی کامیاب کوشش کرتے ہیں۔ انیسؔ کی رباعیوں میں مذہبی اور اخلاقی مضامین کی یکسانیت کے باوجود ایک انفرادی مثال کا احساس ہوتا ہے جو ذہن کو لطیف بنا کر تہذیب نفس کرتا ہے۔ انیسؔ کی رباعیاں اردو ادب کی عظمت کا ایک ناگزیر حصّہ بن گئی ہیں۔

میر انیسؔ کی مرثیہ نگاری، منظر کشی، جذبات، ڈرامائیت، شاعرانہ محاسن اور محاکات نگاری کے اعتبار سے ایک منفرد شان کی حامل نظر آتی ہے۔ مراثی انیس کا نمایاں وصف یہ ہے کہ وہ سوز و گداز اور رثائی تاثر میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ زبان کی سلاست اور شیرینی نے انہیں ایک نئی دلکش گھلاوٹ عطا کی ہے۔ میر انیسؔ کی زبان لکھنو کی ٹکسالی زبان ہے۔ انہوں نے لکھنو کے محاورات و روز مرّہ اور مخصوص طرز تکلم کی اچھی نمائندگی کی ہے۔ دبیرؔ اور انیسؔ نے اخلاقی اور مذہبی موضوعات پر رباعیاں بھی کہی ہیں اور سلام بھی۔

میر انیسؔ کے کلام کی ایک اور اہم خصوصیت یہ ہے کہ اپنی مراثی میں وہ دلکش مناظر اور واقعات کی بڑی متحرک تصویریں کھینچ دیتے ہیں۔ انیسؔ نے حضرت امام حسین کی زندگی کی اچھی مرقع کشی کی ہے۔ وہ واقعہ نگاری میں کمال رکھتے ہیں۔ وہ واقعات ہو بہو نقل نہیں کرتے بلکہ اپنے تخیل سے ان میں رنگ بھرتے ہیں۔ میر انیسؔ کے تمام مرثیوں میں حرکت اور تسلسل سے متعلق بیانات کی کثرت ہے سراپا، چہرہ، واقعات رزم اور بین کے مختلف مراحل ہیں۔ میرؔ انیس کی نظر حرکت پر ہوتی ہے۔ تلمیحات، کنایوں اور تشبیہات استعارات کی مدد سے وہ سامع کے ذہن اور اس کی توجہ کو جس طرف چاہیں موڑ دیتے ہیں۔

مناظر قدرت کی تصویریں مرثیے کی ساخت میں اہم درجہ رکھتی ہیں۔ خارجی شاعری میں اردگرد کے مناظر کی اس لئے اہمیت ہے کہ ان سے ماحول آفرینی میں بڑی مدد ملتی ہے۔ انیسؔ نے ان مناظر کو اپنے مرثیوں میں پس منظر کے طور پر استعمال کیا ہے اور ان کی واقعہ نگاری میں جان ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ انیسؔ نے مرثیوں میں اخلاق کی تعلیم بھی دی ہے مثلاً نیکی، بلند کرداری، ایثار اور حق گوئی وغیرہ۔ انیسؔ کو زبان پر عبور حاصل ہے۔ وہ الفاظ کی موزونیت اور مناسبت سے بخوبی واقف ہیں۔ انہوں نے اپنے مرثیوں سے اردو زبان کے دامن کو بہت وسیع کیا۔ اگرچہ انیسؔ مرثیہ کے شاعر ہیں لیکن ان کا مرتبہ رباعی میں بھی اتنا ہی بلند ہے جتنا مرثیہ میں۔ انیسؔ کا ہر مرثیہ رزمیہ (Epic) سے مشابہت رکھتا ہے۔ کیونکہ ہر مرثیہ میں ایک مذہبی نوعیت کا ہیرو ہے وہ ایک مرثیہ میں کسی ایک ہیرو یا شہید کا احوال بیان کرتا ہے۔ یہ تمام باتیں مرثیہ اور رزمیہ دونوں میں مماثلت رکھتی ہیں۔ میر انیسؔ نے معرکہ آرائی کے لوازمات مثلاً، گھوڑا، اسلحہ اور میدان جنگ کے بے مثل مرقعے اپنے مرثیوں میں پیش کئے ہیں۔ انیسؔ کے مراثی رزمیے کا اعلیٰ ترین نمونہ ہیں۔ میر انیسؔ و دبیرؔ کے مرثیے رزمیے سمجھے جانے کے مستحق ہیں۔

مراثی انیسؔ میں ڈرامائی عنصر بھی موجود ہے۔ میر انیسؔ نے مکالمہ نگاری کردار نگاری اور حرکت و عمل سے جو ڈرامے کے اہم اجزاء ہیں بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ کام لیا ہے۔ انیسؔ کی زبان دانی، قدرت بیانی، الفاظ پر ان کی مضبوط گرفت نازک سے نازک مسئلہ اور کیفیت کو بہ حسن وخوبی ادا کرنے کی غیر معمولی صلاحیت، لغات کا انتخاب، لفظوں کی جھنکار اور ان کے صوری آہنگ اور طرز ادا کی جاذبیت و جامعیت نے انیسؔ کے طرزِ اظہار کو ایک انفرادی شان بخشی ہے۔

مرزا دبیر

اردو کے مشہور مرثیہ نگاروں میں دبیر ایک اعلیٰ مقام کے حامل ہیں۔ انیس کے کلام میں فصاحت اور دبیر کے کلام میں بلاغت ہے۔ دبیر کا پورا نام مرزا سلامت علی تھا اور باپ کا نام مرزا غلام حسین۔ پیدائش ۱۸۰۳ء میں ہوئی اور انہوں نے معقول تعلیم و تربیت بھی حاصل کی۔ ہوش سنبھالتے ہی انہیں ایک ایسا شاعرانہ ماحول نصیب ہوا جس میں مرثیے کو بہت زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ دبیر مرثیہ پڑھنے میں مہارت رکھتے تھے۔ مرثیہ اتنے جوش سے پڑھتے کہ مجلس پر خاموشی چھا جاتی۔ جب بین پر پہنچتے تو سامعین بے اختیار رو پڑتے اور اکثر روتے روتے بے ہوش ہو جاتے۔ مرزا نے ابتداء میں مختصر بیانیہ مرثیہ لکھے ان کا مشہور مرثیہ ''بانو بچھلے پہر اصغر کے لئے روتی ہے'' اسی دور کی یادگار ہے۔ مراثی کا بنیادی جذبہ محبت ہے جس میں دلوں کو متاثر کرنے کی غیر معمولی صلاحیت موجود ہے۔ اس لئے اپنے مرثیوں میں وہ حسب ضرورت، محبت، نفرت، غصہ، عبرت اور ایثار و قربانی کے جذبات کی بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ مصوری کرتے ہیں۔ مرزا دبیر نے جذبات غم والم کی تصویر کشی کرتے ہوئے اپنے ہیرو کے اعلیٰ نسبی اور پیغمبر اسلام سے ان کی نسبت کو بھی واضح کر دیا ہے تا کہ سننے والوں کی روحانی عظمت و جلالت کا بھی اندازہ ہو جائے۔ شہادتِ حسین کے وقت ان کی بہن حضرت زینب کا یہ بین ملاحظہ ہو۔ جس میں مرزا دبیر نے حزنیہ جذبات کی بڑی اچھی آئینہ داری کی ہے۔

وہ رونا بے کس کا وہ گھبرانا یاس کا
وہ تھر تھرانا دل کا وہ اڑنا حواس کا
کہنا بلک بلک کے یہ کلمہ مہر اس کا
اے شمر واسطے علی اصغر کی پیاس کا
للہ تین روز کے پیاسے کو چھوڑ دے
صدقہ نبیؐ کا ان کے نواسے کو چھوڑ دے
تھم جا خدا کو مان حبیب خدا کو مان
زہراؓ کو مان حضرت مشکل کشا کو مان
سوگند فقر فاقہ آلِ عبا کو مان

اپنی رسول زادہ کی تو التجا کو مان
سارے بزرگ مرگئے مجھ بدنصیب کے
میراکوئی نہیں ہے سوااس غریب کے

مرزادبیرؔ کو واقعہ نگاری میں کمال حاصل تھا۔واقعہ کربلا تاریخ اسلام کا ایک مہتم بالشان کارنامہ ہے۔اورحق وباطل کی جنگ کاایک ان مٹ نقش ہے۔شبلی نعمانی ''موازنۂ انیسؔ ودبیرؔ''میں لکھتے ہیں کہ دبیرکوواقعہ نگاری پرعبورحاصل تھا۔رزم نگار کی حیثیت سے بھی دبیرؔ کا ایک مقام ہے۔دبیرؔ کے کلام سے رزمیہ حصوں کا انتخاب کرکے سرفرازحسین خبیر نے''رزم نامہ دبیر''مرتب کیاہے۔رزمیہ مضامین سے مرزا کی طبیعت کومناسبت تھی اوروہ اس فن سے بھی واقفیت رکھتے تھے۔فارسی شاعری سے واقفیت نے مرزادبیرؔ کے کلام میں خیال بندی اورمضمون آفرینی کے جوہروں کو نکھاردیاہے۔مضمون آفرینی سےطبیعت کی جولانی دکھانا دبیرؔ کا خاص فن ہے۔تشبیہات واستعارات کے استعمال میں بھی دبیرؔ نے جدت طرازی سے کام لیاہے۔مراعات النظیر ، نیز تضاد، تجنیس،تنسیق الصفات،ردالعجز ،عالی الصدر ،لف ونشرکی سینکڑوں مثالیں دبیرؔ کے مراثی میں موجود ہیں۔۱۸۵۷ء کے حالات نے دبیرؔ کووطن چھوڑنے پرمجبورکردیا۔ وہ کئی جگہ پہنچےلیکن سکون نہیں ملااورمصیبتیں بڑھتی گئیں۔ضعیفی میں ان کا جوان بیٹا انتقال کرگیااورانہوں نے اپنی بینائی کھودی۔ واجدعلی شاہ نے کلکتہ بلاکر علاج کا انتظام کیااور بینائی واپس آگئی۔۱۸۷۵ء میں دبیرؔ کالکھنومیں انتقال ہوا،اورانہیں اپنے مکان ہی میں دفن کیا گیا۔اردومرثیہ نگاری میں دبیرؔ کانام ناقابلِ فراموش ہے۔

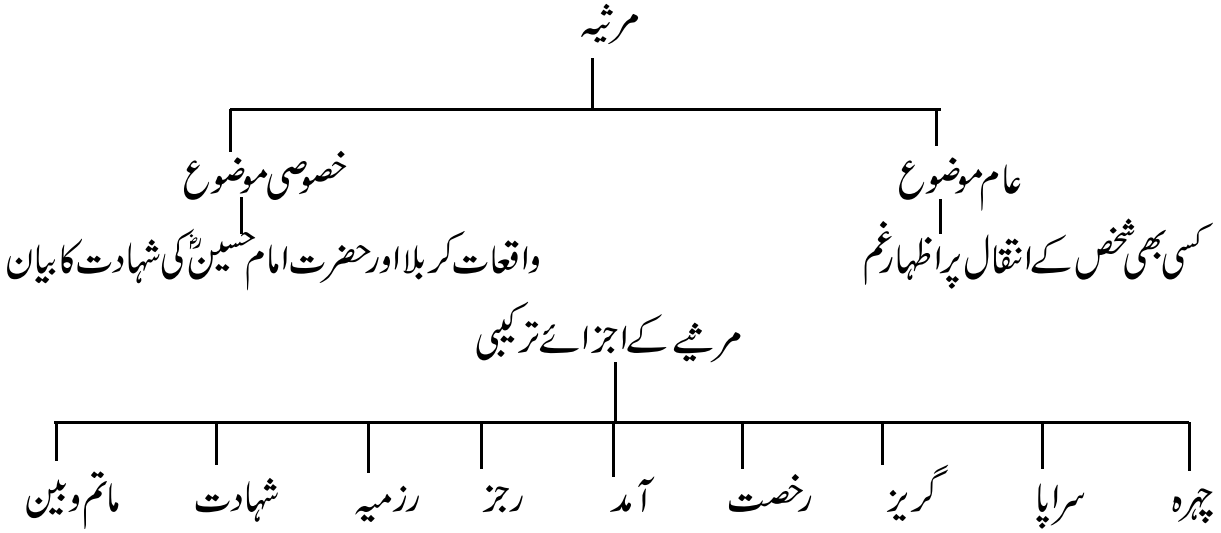

II - Prose باب۔۲۔ نثر

داستان

داستان کی تعریف

داستان ایسی کہانی ہوتی ہے جس میں زندگی کا بیان تخیل کے ساز پر کیا جاتا ہے۔داستانوں میں ایک ایسی زندگی تخلیق کی جاتی ہے جو کہ حقیقت میں موجود نہیں لیکن حقیقی معلوم ہوتی ہے۔داستان کو دلچسپ بنانے کے لئے عموماً مافوق الفطری عناصر سے کام لیا جاتا ہے۔رومان دراصل ایسے قصے کو کہا جاتا ہے جس میں خیالی وجذباتی کہانی بیان کی گئی ہو اس لئے داستانیں ہمیشہ رومانی اور غیر اصلی ہوتی ہیں۔رومان یا رومانس سے حُسن وعشق مراد نہیں ہوتا بلکہ خارجیت مراد ہوتی ہے۔لیکن رومانس یا داستان میں عشق کا جذبہ شدید اور حاوی ہوتا ہے۔لیکن ہر داستان کے لئے یہ لازمی شرط قرار نہیں دیا جاسکتا۔داستانیں اخلاقی بھی ہوتی ہیں اور رومانی بھی۔

پروفیسر گیان چند جین جو کہ اردو داستانوں پر اکسپرٹ تسلیم کئے جاتے ہیں اردو داستانوں کی تعریف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔رومانی داستانوں میں ایک خیالی دنیا اور خیالی واقعات کا بیان ہوتا ہے۔اس پر تخلیق کا رنگین مرمری بادل چھایا رہتا ہے۔اس میں کوئی فوقِ فطری مخلوق نہ بھی ہو تب بھی اس میں جو واقعات بیان کئے جاتے ہیں وہ حقیقی سے زیادہ تخیلی ہوتے ہیں،فوق الفطرت کی تحیّر خیزی،حسن وعشق کی رنگینی،مہمات کی پیچیدگی لطف وبیان انہیں عناصر سے داستان عبارت ہے،ایک دل کو اٹکا لینے والی کیفیت اور اس کے بعد ایک فرحت وآسودگی کا احساس داستان اور داستان گو کا تحفہ ہے۔داستان سے ملتی جلتی کہانی کی ایک اور قسم بھی اردو میں مقبول ہے جسے ہم حکایات کے نام سے جانتے ہیں۔''حکایت'' میں بھی کہانی بیان کی جاتی ہے لیکن اس میں اخلاقی درس اور پند ونصائح مقصود بالذات ہوتے ہیں۔داستان میں پند ونصائح مطلق نہیں ہوتے۔پروفیسر گیان چند جین،حکایت اور داستان،حکایت نویس اور داستان گو کے رویہ اور فرائض کا تقابلی مطالعہ کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''داستان کا مصنف واعظ اور ناصح نہیں ہوتا۔۔۔اس کا وار عقل سے زیادہ دل پر ہوتا ہے۔فکر سے زیادہ جذبہ کو بیدار کرنا ہوتا ہے۔جب کہ حکایت میں اس کے برعکس ہوتا ہے۔حکایت میں (عموماً) ایک بوڑھا بچوں سے خطاب کرتا ہے۔ داستان میں ایک مست شباب دوسرے وارفتگان شباب کے سامنے میٹھی تانیں اڑاتا ہے۔ حکایت نویس

ایک حکیم بزرگ ہوتا ہے، داستان گو ایک رند خانہ سوز ہے۔ اردو میں حکایت اور داستانوں کا بڑا ذخیرہ موجود ہے اور دونوں کی روایت ملتی ہے ۔حکایات میں ''حکایات لقمان'' ''حکایات سعدی''، حکایاتِ لطیفہ''، حکایات جلیلہ'' اور ''حکایات سلمان''مشہور ہیں۔اسی طرح اردو کی مشہور داستانیں حسب ذیل ہیں:

سب رس، قصہ ملک محمود گیتی افروز، چار درویش، حاتم طائی، گلِ بکاولی، گل وصنوبر، فسانۂ عجائب، امیر حمزہ، بوستانِ خیال، سروش سخن اور طلسم حیرت ان کے علاوہ مختصر داستانوں میں ذیل کی داستانیں معروف ہیں۔

طوطا کہانی، سنگھاسن بتیسی، بیتال پچیسی، رانی کیتکی اور کنور اودے بھون وغیرہ

داستانوں کی خصوصیات: داستانوں میں عموماً کہیں نہ کہیں فوق فطرت کی کارفرمائی ضرور پائی جاتی ہے جس سے یہ غلط فہمی عام ہوگئی ہے کہ فوق الفطری عناصر داستانوں کا جزو لاینفک عنصر ہی نہیں بلکہ داستان کا اختیاری جزو ہے لیکن یہ حقیقت نہیں کہ فوق فطرت عناصر داستانوں کی جبلّت، لازمی جزو ہیں۔فوق فطرت عناصر ہی کی طرح حسن وعشق کو بھی داستانوں کا لازمی عنصر سمجھ لیا جاتا ہے۔حسن وعشق داستانوں میں قدر مشترک کی حیثیت ضرور رکھتے ہیں،لیکن یہ بھی لازمی عنصر نہیں ہوتا عشق کا آفاقی اور دوامی جذبہ یقیناً داستان کا ایک اہم عنصر ہوتا ہے لیکن اسے بھی ناگزیر نہیں قرار دیا جاسکتا ہے۔مثلاً الف لیلیٰ میں سند باد جہازی کی داستان،سوتے جاگتے کی کہانی یا علی بابا اور چالیس چور میں حسن وعشق کا کوئی ذکر وتذکرہ نہیں ملتا۔بوستان خیال کے مترجم خواجہ امان نے حدائق انظار کے دیباچے میں داستان کی حسبِ ذیل خصوصیات گنائی ہیں:

''ظاہر ہے کہ نفس قصص اور افسانے کے واسطے چند مراتب لازم وواجب ہیں۔اول مطلب وخوش نما جس کی تمہید وبندش میں توارد مضمون اور تکرار بیان نہ ہو۔مدتِ دراز تک اختتام کے سامعین مشتاق رہیں۔

دوم بجز مدعائے خوش ترکیب ومطلبِ دل چسپ کوئی مضمون سمعہ خراش وہزل۔۔۔درج نہ کیا جائے،

سوم لطافت زبان وفصاحت بیان

چہارم عبارت سریع الفہم کے واسطے فن قصہ کے لازم ہے۔

پنجم تمہید قصہ میں بحسنہ تواریخ گذشتہ کا لطف حاصل ہو۔نقل واصل میں ہرگز فرق نہ ہوسکے۔۔۔

(دیباچہ حدائق انظار)

اردو داستان کی تاریخ: اردو میں داستان کی روایت نہایت استوار اور متہم بالشان ہے۔ اردو کی سب سے قدیم داستان (اب تک معلوم داستان) ''سب رس'' ہے جس کا مصنف اسداللہ ملاّ وجہی ہے۔ وجہی دکن کے قطب شاہی دربار سے وابستہ تھا۔ اسی عہدِ عبداللہ قطب شاہ میں بادشاہ کی فرمائش پر ''سب رس'' ۱۰۴۵ھ مطابق ۱۶۳۵ء میں لکھی ''سب رس'' ایک تمثیل ہے اور اس کا قصہ بیک وقت دو سطحوں پر چلتا ہے۔ ''سب رس'' محمد یحییٰ بن سیبک فتاحی نیشاپوری کی مثنوی ''دستور العشاق'' کے ''نثری خلاصے حسن و دل'' سے ماخوذ ہے اور۔ ابن سیبک نے یہ قصہ کرشن مشر کی تمثیل (ڈرامہ) ''پربودھ چندرودے'' نامی سنسکرت قصہ سے اخذ کیا ہے۔

''سب رس'' کے بعد دکن میں یوں تو کئی داستانیں مزید لکھی گئیں۔ لیکن ادبی اعتبار سے یہ تمام داستانیں، داستان کی روایات اور معیار پر پوری نہیں اترتیں، 'سب رس' کے بعد ہمیں اردو میں جو اہم داستان ملتی ہے وہ ہے ''قصہ مہر افروز دلبر''، 'قصہ مہر افروز، دلبر' شمالی ہند کی پہلی نثری داستان ہے۔ جس کا مصنف عیسوی خان ہے۔ یہ داستان ۱۷۲۰ء سے ۱۷۵۴ء کے درمیان کسی زمانے میں تصنیف ہوتی ہے۔ اس داستان کی خوبی اس کی نثر ہے جس میں بول چال کا انداز اپنایا گیا ہے۔ اور زبان تشکیلی دور کی معلوم ہوتی ہے۔ اس اہم اردو داستان کو پروفیسر مسعود حسین خان نے دریافت کیا اور مرتب و شائع کیا۔ ''قصہ مہر افروز و دلبر'' کے بعد شمالی ہند میں اہم ترین داستان قصہ چار درویش بنام نوطرز مرصع ملتی ہے۔ عیسوی خان بہادر نے اپنی داستان میں ادبی زبان برتی ہے اور اکثر و بیشتر مرصع زبان لکھی ہے۔ میر محمد حسین عطا خاں تحسین نے نوطرز مرصع ۱۷۶۸ء میں لکھنا شروع کی اور اس کی تکمیل ۱۷۷۵ء میں ہوئی اس داستان میں چار درویش اور ایک بادشاہ کا قصہ لکھا گیا ہے۔

''نوطرز مرصع'' سے متاثر ہو کر مہر چند مہر کھتری نے ۱۲۰۸ء میں ''نوآئین ہندی'' کے نام ایک مختصر داستان لکھی۔ یہ داستان بعد ازاں قصّہ ملک گیتی افروز کے نام سے مشہور ہوئی۔ یہ دراصل ''نوآئین ہندی' کی ایک ضمنی کہانی ہے۔ مہر نے تحسین کے برخلاف زبان سادہ اور سلیس لکھی ہے۔ جس زمانے میں ''نوطرز مرصع'' اور ''نوآئین ہندی'' جیسی داستانیں تصنیف ہوئیں اس وقت دہلی کے تخت پر شاہ عالم ثانی آفتاب براجمان تھے۔ آفتاب اچھے شاعر ہی نہیں ایک اچھے نثار بھی تھے۔ باوجود نابینا ہونے کے انہوں نے چار جلدوں میں ایک داستان ''عجائب القصص'' کے نام سے تصنیف کی۔ یہ داستان ۱۲۰۷ھ میں لکھنی شروع کی۔ تاریخ اختتام کا علم نہیں بہر حال ۱۲۱۰ھ تک مکمل ہوگئی۔

''عجائب القصص'' بہ اعتبار زبان اور بہ اعتبار مواد بڑی اہم داستان ہے۔اس داستان میں قلعہ معلٰی کی معاشرت اور بول چال کی جھلکیاں واضح انداز میں دیکھی جاسکتی ہیں۔اس داستان کا طرز نگارش ''نوطرز مرصع'' کی طرح مسجع اور مرصع ہے اور نہ ہی قصہ ملک محمود گیتی افروز'' کی طرح یکسر سادہ، بلکہ آفتابؔ نے سلیس اور مرصع زبان لکھی ہے۔

فورٹ ولیم کالج: ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج کا قیام عمل میں آیا۔نو وارد انگریزوں کی تعلیم کے لئے یہاں گل کرسٹ کی نگرانی میں فارسی اور سنسکرت کی داستان کے تراجم آسان اور سلیس بامحاورہ اردو میں کروائے گئے۔یہاں ترجمہ ہونے والی داستانوں کو عموماً اردو کے ساتھ ہندی میں بھی شائع کیا جاتا تھا۔فورٹ ولیم کالج سے شائع ہونے والی داستانوں میں سب سے ممتاز ''باغ و بہار'' ہے جسے میر امن دہلوی نے اردو کا پیرایہ عطا کیا ہے۔اس میں تحسین کی بیان کردہ قصہ چار درویش کو بیان کیا ہے لیکن میر امن نے دہلی کی بامحاورہ زبان میں دہلی کی تہذیب و معاشرت کا بیان اس خوبی سے کیا کہ داستان شاہکار کے درجے پر فائز ہوگئی۔''آرائش محفل'' اور ''طوطا کہانی'' یہ تمام داستانیں ۱۸۰۳تک شائع ہوئیں۔اسی زمانہ میں سنسکرت سے بھی چند داستانیں اردو میں ترجمہ کی گئیں۔

فورٹ ولیم کالج سے باہر لکھی گئی داستانیں: فورٹ ولیم کالج سے باہر بھی اردو داستان کا ارتقائی سفر جاری وساری رہا۔ چنانچہ انشااللہ خان انشاؔ نے ''سلک گوہر'' اور قصہّ'' رانی کیتکی'' اور'' کنور اودے بھان'' دوداستانیں لکھیں۔انشاء کی یہ دونوں داستانیں منفرد حیثیت کی مالک ہیں۔سلک گوہر انہوں نے ۱۲۱۴ھ کے قریب لکھی یہ مکمل داستان صنعت غیر منقوط میں لکھی گئی ہے۔انشاء نے شعوری طور اس بات کا اہتمام والتزام کیا کہ پوری داستان میں کوئی لفظ نقطہ والا استعمال نہ کیا جائے۔مثال کے طور پر سلک گوہر سے ایک اقتباس درج کیا جاتا ہے:

''در عالم علوحوصلہ کہ سالہا سال ہم کو

سوداسا مطالعہ احوال ملوک عالم کا رہا۔ملک روس اور

ملکہ گوہر آرا کا حال اس طرح معلوم ہوا۔۔۔

انشاؔء نے داستان سلک گوہر تمام بے نقطہ لکھی ہے اور اپنی دوسری داستان'' کہانی رانی کیتکی'' اور'' کنور اودے بھان'' میں یہ التزام کیا ہے کہ ساری داستان خالص ہندوستانی میں لکھی جائے اور عربی فارسی وترکی زبان کا کوئی لفظ داستان میں استعمال نہ کیا جائے۔۔انشاؔء نے یہ داستان ۱۸۰۸ کے بعد لکھی ہے۔

رجب علی بیگ سرورؔ نے فسانۂ عجائب ۱۲۴۰ھ میں مطابق ۱۸۲۴ء لکھی۔فسانہ عجائب بہ اعتبار داستان جتنی اہم ہے اس کا دیباچہ بھی لکھنو کی تہذیب کے نقوش کی حیثیت سے نہایت اہم سمجھا جاتا ہے۔

فسانہ عجائب کے حوالے سے داستان کی تدریس:

فسانۂ عجائب کی کہانی مختصراً اس طرح ہے۔سرزمین ختن میں قسمت پور نام کا ایک شہر تھا جس کا بادشاہ فیروز بخت ہے بہت نیک، عابد پاکباز اور پرہیزگار۔خدا کا دیا سب کچھ اس کو میسر ہے لیکن کمی ہے تو اپنے وارث اور اولاد کی۔ بادشاہ کی عمر زیادہ ہو چکی ہے۔اب وہ اولاد سے مایوس ہو چکا ہے۔آخر کار اللہ مہربان ہوتا ہے اور فیروز بخت کی ایک بیگم کو لڑکا تولد ہوتا ہے۔نجومی بتاتے ہیں کہ پندرہ برس کی عمر میں شہزادے کی جان کو خطرہ ہے۔

شہزادہ ابھی پندرہ برس کی عمر کو نہیں پہنچ پاتا ہے کہ اس کی شادی ماہ طلعت کے ساتھ کر دی جاتی ہے۔ایک روز شہزادہ بازار میں دیکھتا ہے کہ ایک عجیب وغریب بات کرنے والا طوطا برائے فروخت ہے۔وہ اسے خرید کر اپنے محل لے آتا ہے۔ایک دن شہزادے کی غیر موجودگی میں ماہ طلعت طوطے سے اپنے حسن و جمال کی داد چاہتی ہے۔طوطا منہ پھٹ ہے کہ خدا نے دنیا میں ایک سے ایک حسین پیدا کئے ہیں۔فلاں ملک میں ایک شہزادی انجمن آرا رہتی ہے جس کا ثانی نہیں۔ماہ طلعت کو طوطا کی یہ باتیں ناگوار گذرتی ہیں اور وہ خفا ہو جاتی ہے۔جب شہزادہ آتا ہے تو ماہ طلعت طوطے کی گستاخی سناتی ہے۔شہزادہ جان عالم ماہ طلعت کو سمجھاتا ہے کہ جانور کی بات کا کیا اعتبار لیکن لاشعوری طور پر انجمن آرا کے حسن کا شیدا ہو جاتا ہے اور ایک دن طوطے کو رہنما اور رہبر بنا کر انجمن آرا کی تلاش میں نکل کھڑا ہوتا ہے۔

فسانۂ عجب میں داستانی رنگ جان عالم کے اس سفر سے شروع ہوتا ہے۔اس سفر میں جان عالم کو قدم قدم پر فوق فطری عناصر سے سابقہ پڑتا ہے۔اسی سفر کے درمیان جان عالم ملکۂ زرنگار پر عاشق ہوتا ہے۔اور اس سے شادی کر لیتا ہے۔آخر کار اسم اعظم کی مدد سے جادوگروں، سحر کاروں کو شکست دیکر انجمن آرا تک پہنچتا ہے۔اس سے شادی کرتا ہے اور واپس گھر آتا ہے اور کہانی ہر داستان کی طرح اس مخصوص جملے پر ختم ہوتی ہے۔کہ جیسے ان کے دن پھرے ہمارے تمہارے دن بھی ویسے ہی پھریں۔

داستان کی ابتدا مثنوی میر حسنؔ یعنی ''سحر البیان'' سے مشابہ ہے۔اول بادشاہ کا بے اولاد ہونا اس کے بعد مایوس ہونا جب کہ اسے شہزادہ یا وارث پیدا ہونا۔ نجومیوں کا بلایا جانا پھر نجومیوں کی پیشین گوئی کہ پندرھویں برس میں خطرہ

ہے۔ غرض ابتدائی حصّہ مثنوی سحرالبیان سے اخذ کیا گیا ہے۔

فسانۂ عجائب میں تبدیلی قالب کا واقعہ بھی ملتا ہے۔شہزادہ اور وزیرزادہ دونوں ہی تبدیلیٔ قالب کے فن سے واقف ہیں۔شہزادہ بندر کا قالب اختیار کرتا ہے اور پھر طوطے کے قالب میں آتا ہے۔یہ واقعات دکنی داستانوں کے علاوہ پنچ تنتر اور بیتال پچیسی میں مل جاتے ہیں۔تبدیلی قالب اور اس قصے کی وجہ سے داستان میں تجسس اور پلاٹ میں دلچسپی پیدا کی گئی ہے۔

رجب علی بیگ سرور نے لکھنوی تمدن اور معاشرت کے بہت اچھے نقوش فسانہ عجائب میں بیان کئے ہیں اور داستان کے متن میں لکھنوی معاشرت بولتی نظر آتی ہے۔انجمن آرا کے مانجھے،شادی،جہیز اور سواری کا بیان دیکھئے۔

''یکا یک غول خاص برداروں کا آیا،کم خواب کی مرزائی،انگرکھے گجراتی،مشروع کے گھٹنے۔،رولی کی ناگوری پاؤں میں ،سر پر لپیٹے طرح دار، خاصیوں کے غلاف باناتی سفرلاتی ململ کے سینگرے ،ساز مطلا جھلا جھل کے۔۔۔۔برابر انجمن آرا کا سکھ پال پری تمثال ہزاریاں سوکہاریاں، پیاری پیاریاں،جسم گدرایا شباب چھایا۔زربفت واطلس کے لہنگے،مسالہ لگا ململ کے دوپٹے باریک بنّت گوکھروکی کرتی،انگیا کاشانی مخمل کرتیاں ۔۔۔ادھر اُدھر جڑاؤ کڑے ملایم ہاتھوں میں پڑے پاؤں میں سونے کے تین تین چھڑے،کانوں میں سادی سادی بالیاں،نشۂ حسن میں متوالیاں۔۔۔

کسی تہذیب کے مادّی پہلوؤں کے ساتھ ساتھ اس تہذیب کے ذہنی مظاہروں کو سمجھنے کے لئے رسوم ورواج کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔اُس زمانے کی معاشرت میں شگون اور رسوم کی کیا صورتِ حال تھی ایک اقتباس دیکھئے:

''برات کے موقع پر ماما حیلیں دوڑیں، پانی کا طشت ہاتھی کے پاؤں تلے پھینکا۔۔۔بکرا ذبح کیا انگوٹھے میں لہو لگایا پھر کھیر کھلائی۔۔۔۔

وزیرزادہ دھوکے سے شہزادے کے قالب پر قبضہ کرلیتا ہے دیکھئے سرورؔ نے کس طرح بدشگونی کا مشاہدہ مہرنگار کے ذریعے کروایا ہے۔اقتباس دیکھئے: ''خدا خیر کرے آج بہت شگون بد ہوئے تھے۔صبح سے داہنی آنکھ پھڑکتی تھی۔راہ میں ہرنی اکیلی راستہ کاٹ میرا منہ تکتی تھی۔اپنے سائے سے پھڑکتی تھی۔خیمے میں اترتے وقت کسی نے چھینکا تھا خواب متوحش نماز کے وقت دیکھا تھا۔مصیبت کے وقت مغلانیاں وغیرہ کی منت مانگنے کا بیان دیکھئے۔۔۔کوئی کہتی تھی ہمارا لشکر اس بلا سے جو نکلے گا تو مشکل کشا کا کھڑا دونا دوں گی کوئی بولی میں سہ ماہی کے روزے رکھوں گی۔کونڈے

گی،صحنک کھلاؤں گی،دودھ کے کوزے بچوں کو پلاؤں گی''۔

''فسانہ عجائب'' میں سرورؔ نے مرصع اسلوب بیان اختیار کیا ہے۔داستان کی ابتدا کا اقتباس اوپر درج کیا گیا ہے،جس میں مسجع عبارتیں اور مرقع نگاری کی دلکش مثالیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔پھر بھی فارسی کی افراط،مقفی و مسجع فقرے،استعاروں کی نکتہ سنجی،ابہام کی موشگافی،مبالغے کا زور فسانہ عجائب کی چند اہم خصوصیات ہیں۔سرور کے اسلوب نگارش کا ایک بہترین نمونہ شاہکار،بندر کی تقریر ہے۔جس میں بے ثباتی دنیا اور عبرت کے مضامین آٹھ دس صفحوں میں بیان ہوئے ہیں۔اس تقریر میں استعارے کم ہیں ابہام بالکل نہیں پایا جاتا غالباً اس لئے تقریر پُر اثر ہوگئی ہے۔

فسانہ عجائب کے اسلوب پر اظہار خیال کرتے ہوئے پروفیسر گیان چند لکھتے ہیں:

''اس میں کوئی شک نہیں کہ فسانہ عجائب کا اسلوب غیر فطری ہے۔پڑھنے میں قدم قدم پر ٹھوکریں لگتی ہیں۔منظر کشی اور جذبات نگاری کا حق ادا نہیں ہوتا۔سرورؔ کے خیالات بوجھل زربفتی پوشاک میں ملبوس،اس کی قدردانی کے لئے عارضی طور پر قدیم ذہنیت پیدا کیجئے۔ہر جملے کے فقرے کو رک رک کر صحیح عطف واضافت کے ساتھ پڑھئے۔اسی وقت اس کا لطف آئے گا۔ان کی نثر کا لطف دل کے لئے نہیں دماغ کے لئے ہے۔اسے پڑھ کر وجد میں آجانا ممکن نہیں۔

پروفیسر گیان چند کی یہ رائے فسانہ عجائب کے ابتدائی اسلوب سے متعلق ہے جو کہ اس داستان کا طرۂ امتیاز بھی قرار دیا جاتا ہے۔فسانہ عجائب کے اولین مخطوطہ میں یہی سادہ اسلوب ملتا ہے۔۔۔اردو داستان کی عظیم الشان روایت میں دو داستانیں اپنی خصوصیات کی بنا پر نہایت مشہور ہیں ایک میرؔ امن کی باغ و بہار اور دوسرے فسانۂ عجائب۔۔میرؔ امن کی باغ و بہار دہلی کی معاشرت کے نقش اور سادہ سلیس اسلوب کے لئے مشہور ہے اور فسانۂ عجائب لکھنوی معاشرت کے بولتے مرقعے اور مرصع و مسجع ایہام کے اسلوب کے لئے ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔

ڈرامہ

ڈرامے کی تعریف:۔ڈراما ادب کی بے حد دلچسپ اور مقبول عام صنف ہے۔مقاصد کے نظریہ سے وہ سماجی ہے اور انسانی شعور کی گہرائیوں میں غوطہ لگا کر جذبات کو بیدار کرتا ہے۔ترقی یافتہ قوموں میں اسے بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ڈرما فن بھی ہے اور ایک صنفِ ادب بھی اور دونوں حیثیتوں سے اس کو زمانۂ قدیم سے بڑی اہمیت حاصل ہے۔اس کو فنون لطیفہ کی قدیم ترین شکلوں میں شمار کیا جاتا ہے۔اور آج بھی اس کی مقبولیت میں کلام نہیں۔ صنف ادب کی

حیثیت سے بھی ڈراما کی قدامت مسلّم ہے۔ عالمی ادب کے بیشتر آفاقی شاہکار اسی صنف سے تعلق رکھتے ہیں۔

ڈرامے کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ محض پڑھی جانے والی صنف نہیں ہے۔ بلکہ کھیلی جانے والی صنف بھی ہے۔ پھر ڈرامہ نہ محض مکالموں کا نام ہے نہ محض اسٹیج کے لئے دی ہوئی قوسینی عبارتوں کا یہ سب تو ایک حصّہ ہیں اور یہ اس مکمل وحدت کا ایک جز ہیں جن سے اسٹیج ڈرامے کی پوری جمالیاتی کیفیت عبارت ہے۔ اس لحاظ سے ڈرامے کا مطالعہ بنیادی طور پر اسٹیج کے نقطۂ نظر سے کیا جانا چاہئے۔ ڈراما یونانی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں کر کے دکھانا۔

یہ ایک ایسی صنف ادب ہے جس میں انسانی زندگی کی حقیقتوں اور صداقتوں کو اسٹیج پر نقل کے ذریعے پیش کیا جاتا ہے۔ نیز یہ ایک پیچیدہ فن بھی ہے جسے اداکار اور ہدایت کار کی مشترکہ کوشش پایۂ تکمیل کو پہنچاتی ہے۔

ڈرامے کے اجزائے ترکیبی:

زمانۂ قدیم میں ڈرامے کے دو بڑے مرکز یونان اور ہندستان رہے ہیں۔ دونوں مراکز پر ڈرامے کی جداگانہ روایتیں تھیں اور اسی مناسبت سے دونوں مراکز پر اس فن کے جداگانہ اصول مرتب کئے گئے۔

ہندوستانی ڈرامے کے اصول پہلی مرتبہ بھرت منی نے اپنی مشہور تصنیف ''ناٹیہ شاستر'' میں پیش کئے۔ بھرت منی نے ڈرامے کے پانچ لوازم قرار دیئے ہیں۔

۱) لباس
۲) آواز
۳) اعضائے جسم کے حرکات
۶) رقص اور
۷) موسیقی

سنسکرت میں ڈرامے کو دو حصّوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

(۱) بھاؤ (۲) رس

بھاؤ: سے مراد وہ عمل ہے جو اسٹیج سے اداکاری، پلاٹ، مکالمے، رقص اور موسیقی وغیرہ کی صورت میں اداکار پیش کرتا ہے۔